© rasailojaraid.com

اقلیتوں کا مسئلہ

یہ باب چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں اقلیت کے مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے اور اقلیتوں کے حقوق، مراعات اور مرتبے پر گفتگو کی ضرورت کے خطوط متعین کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں اقلیتوں کے بارے میں اسلام کے موقف، یا مزید واضح طور پر کہا جائے تو اُن معاملات پر اسلام کے موقف کو بیان کیا گیا ہے جو آج کے دور میں اقلیتوں سے متعلق تصور کیے جاتے ہیں۔ تیسرے حصے میں غیر مسلم ملکوں میں مسلمان اقلیتوں کے حالات پر نگاہ ڈالی گئی ہے۔ جبکہ چوتھا اور آخری حصہ عالم اسلام بالخصوص پاکستان میں اقلیتوں کے موجودہ مقام و مرتبے اور حالات کے مختصر جائزے پر مشتمل ہے۔

اقلیت کی تعریف

اقلیت کی تعریف کیا ہے؟ لغوی طور پر کوئی بھی ایسی جمعیت جو کسی علاقے میں رہنے والے لوگوں کی اکثریت سے مختلف ہو، اقلیت ہے۔ تاہم اقلیتوں کے لیے آئین و قانون یا حقوق و مراعات پر گفتگو میں اس حوالے سے مزید وضاحت کی ضرورت ہے کہ کسی انسانی جمعیت کو کن حالات میں اقلیت قرار دیا جاسکتا ہے؟ مثال کے طور پر کسی علاقے میں داڑھی منڈوانے والے افراد کی اکثریت میں اگر تھوڑے سے لوگ داڑھی والے ہوں یا صورت حال اس کے برعکس ہو تو ایسے اختلافات کسی کو اقلیت قرار دیے جانے کے لیے کافی نہیں ہوتے۔ لہٰذا اس موضوع پر گفتگو کے مقاصد کے لیے وہ معنی کافی نہیں ہیں جو انگریزی کے لغت نویسوں نے اقلیت کی اصطلاح کے لیے مختص کیے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ ممکن ہے کہ مزید سماجی اور سیاسی امتیازات بھی کسی گروہ کے اقلیت باور کیے جانے کے لیے معتبر بنیاد فراہم نہ کرسکیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک گروہ سیاسی یا سماجی اقلیت ہو لیکن پھر بھی وہ حقوق و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مراعات کے کسی الگ مجموعے یا قانون کا ضرورت مند نہ ہو۔ اس کی وجہ ایک حد تک تو یہ ہے کہ سیاسی مفہوم کے اعتبار سے کوئی اقلیت ضروری نہیں کہ، جیسا کہ عموماً ہوتا ہے، مستقل اقلیت ہو۔ آج کی سیاسی اقلیت، کل سیاسی اکثریت بن سکتی ہے۔ اور ایسی عارضی اقلیت کے لیے عام طور پر بحیثیت اقلیت نہ مستقل تعریف کا تعین ضروری ہوتا ہے نہ مرتبے و مراعات اور دوسرے گروہوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کا۔

بین الاقوامی قانون کے محدود سیاق وسباق ہی میں ہمیں اقلیت کی ایسی تعریف ملتی ہے جو اس کے حقوق و مراعات پر بحث و گفتگو سے ہم آہنگ ہے۔ اس سیاق وسباق میں اقلیت کی تعریف لوگوں کے ایک ایسے گروہ کے طور پر کی جا سکتی ہے جو کسی ریاست کے اندر، ریاست کی تاسیس و تشکیل کے بنیادی امور میں، غالب گروہ سے اختلاف رکھتا ہو۔ اس صورت میں اکثریت بالعموم مستقل اکثریت ہوتی ہے اور اقلیت بیشتر صورتوں میں مستقل اقلیت ہوتی ہے۔ ایسی مستقل اقلیتوں کے حقوق و مراعات، موجودہ بین الاقوامی قانون کا ایک اہم جزو بن گئے ہیں۔ لہٰذا ان اقلیتوں کے حوالے سے حقوق اور مراعات کے بنیادی خدوخال کا، بین الاقوامی قانون اور اسلامی قانون دونوں کے تحت بیان کیا جانا برمحل ہے۔

اقلیتوں کی سطور بالا میں پیش کی گئی عملی تعریف سے ایک بنیادی سوال ابھرتا ہے: کسی ریاست یا معاشرے کی تخلیق اور تشکیل کے لیے بنیادی چیز کیا ہے؟

ایک معاشرہ نسلی ہوسکتا ہے جو اپنے افراد اور شہریوں کی نسلی شناخت کو اولین اہمیت دیتا ہو۔ ایسے معاشرے میں اکثریت اور اقلیت کا تعین نسل کی بنیاد پر ہوگا۔ جنوبی افریقہ کے اندر، نسل پرستی کے دنوں میں، اگر ہمیشہ نہیں تو بہرحال بیشتر صورتوں میں، کسی شخص کی نسلی شناخت ہی یہ فیصلہ کرتی تھی کہ اس کے ساتھ معاملہ اقلیت کے رکن کی حیثیت سے کیا جائے یا اکثریت کے رکن کی حیثیت سے۔ جبکہ دوسری طرف یورپ کے بہت سے ملکوں، پوری مسلم دنیا اور دنیا کے دوسرے بہت سے حصوں میں، مختلف نسلی گروپ ساتھ ساتھ رہتے بستے ہیں، اور کوئی بھی ان کے نسلی پس منظر پر کچھ زیادہ توجہ نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیتا۔ فی الحقیقت تمام بڑے مسلمان اور یورپی ملکوں میں، مختلف نسلی پس منظر رکھنے والے کروڑوں لوگ کسی خاص دشواری کے بغیر ساتھ ساتھ رہتے سہتے ہیں۔ ان ملکوں میں ان گروپوں کے مستقبل کے مقام و مرتبے اور مراعات کے فہم وادراک کے حوالے سے کوئی نمایاں اختلاف موجود نہیں۔ بیشتر مسلم معاشروں میں، نسلی شناخت اور نسلی پس منظر بمشکل ہی کبھی اکثریت اور اقلیت کے معاملات کے حوالے سے کسی تنازع کا سبب بنا ہے۔

بعض معاشروں میں، لسانی اختلافات، اقلیت کو اکثریت سے ممیز کرنے کی اہم ترین بنیادوں میں سے ایک ہیں۔ کچھ دوسرے معاشروں میں لوگوں کی ثقافتی ہم آہنگی یا اس کے برعکس کیفیت، اقلیت یا اکثریت کی حیثیت سے ان کی شناخت کا ذریعہ بنتی ہے۔

بہت سے مغربی ملکوں میں اکثر و بیشتر ثقافتی پس منظر، دوسرے عوامل کے ساتھ مل کر، طے کرتا ہے کہ اکثریت کون ہے اور اقلیت کون۔ ماضی کے اکثر مسلمان معاشروں میں، کسی شخص کا مذہبی عقیدہ اس بات کے تعین میں اولین اہمیت رکھتا تھا کہ اس کا تعلق اکثریت سے ہے یا اقلیت سے۔ مسلمان ملکوں میں یہ بات آج بھی درست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی نظام میں معاشرے اور ریاست کو بنیادی طور پر اسلام سے وابستگی ہی اعتبار اور جواز عطا کرتی ہے اور اسلام اولاً ایک مذہبی پیغام ہے۔ مسلمان قرآن سے ہدایت حاصل کرتے ہیں، جو فی الاصل ایک مذہبی کتاب ہے، اور جو ایک مذہبی ذریعے سے جس کا نام وحی ہے، انسانیت کی رہنمائی کے لیے بھیجی گئی ہے۔ لہٰذا ایک شخص کی مذہبی وابستگی اور مذہبیت مسلم ملکوں میں اسی طرح طاقتور، اہم اور مربوط و برمحل ہے جیسے نسل پرست جنوبی افریقہ میں نسلی شناخت یا بعض مغربی ملکوں میں ثقافتی وابستگی اور بعض دوسرے ملکوں میں لسانی تعلق۔

اس لیے اکثریت اور اقلیت کی درست اور جامع تعریف مختلف ملکوں اور مختلف معاشروں میں مختلف ہو سکتی ہے۔ پاکستان میں تقریباً ۹۷ فی صد آبادی مسلمان ہے۔ ان میں مختلف نسلی پس منظر کے لوگ شامل ہیں۔ بہت سے اُن لوگوں کی اولاد ہیں جو پچھلی صدیوں میں عرب، ایران اور وسط ایشیا سے یہاں آ کر آباد ہوئے۔ ان نسلوں کے لوگ اُن مقامی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ رہتے بستے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جن کے آباء واجداد نے ہندو مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا۔ ماضی بعید میں مشرقی یورپ سے بھی بڑے بڑے گروہوں نے ترک وطن کر کے برصغیر کا رخ کیا تھا۔ ان میں سے بہت سے گروپوں نے اپنی نسلی شناختوں اور حوالوں کو اب تک برقرار رکھا ہوا ہے۔ اس کے باوجود ان کے بارے میں کبھی اکثریت یا اقلیت ہونے کا سوال نہیں اٹھتا۔ اس مثال سے واضح ہے کہ اکثریت اور اقلیت کی بنیاد کے سوال کو مختلف سیاق وسباق میں مختلف طریقوں سے طے کیا جانا چاہیے۔

یہ بات اقوام متحدہ کی متعلقہ دستاویزات میں اب کسی حد تک تسلیم کر لی گئی ہے۔ یہ دستاویزات بالخصوص اور بین الاقوامی قانون کے ہم عصر ناشرین ومشتہرین کے کام بالعموم، متخاصم یا غیر دوستانہ اکثریت کی بالادستی کے مقابلے میں اقلیتوں کے حقوق ومراعات کے حوالے سے ہیں۔ اگر چہ ان دستاویزات میں اقلیت کی قانونی اور آئینی اصطلاحات میں رسمی اور مخصوص طور پر تعریف کی کوشش بہت کم ہی کی گئی ہے، تاہم جس طور پر ان میں متعلقہ موضوعات پر بات کی گئی ہے، اور اقلیتوں کے حقوق ومراعات کے تحفظ کے معاملے میں جس رجحان کا مظاہرہ کیا گیا ہے، اس سے بنیادی مفہوم بڑی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔

اس سیاق میں ہم انسانی حقوق سے متعلق ان دستاویزات کا حوالہ دے سکتے ہیں جو اقوام متحدہ کے مختلف اداروں کی جانب سے تیار کی گئی ہیں، ان میں وہ دستاویزات شامل ہیں جو مختلف بنیادوں پر کسی گروہ کے خاتمے کے عمل یا امتیازی سلوک سے بحث کرتی ہیں، نسل کشی کو ممنوع قرار دیتی اور اس پر پابندی لگاتی ہیں، اور ایسے ہی دوسرے موضوعات سے متعلق ہیں۔ ان تمام دستاویزات میں اقلیت کی اصطلاح میں بالعموم ان گروہوں کو شامل کیا گیا ہے جو کسی علاقے کی اکثریت سے نسلی، مذہبی یا فکری بنیاد پر اختلاف رکھتے ہوں۔ اقوام متحدہ کے شہری اور سیاسی حقوق کے کنونشن کی دفعہ ۲۷ زیر بحث موضوع سے متعلق اور اہم ہے۔ یہ بہت واضح طور پر اقلیت کی تعریف کرتی ہے اور اسے نسلی، مذہبی یا لسانی گروہوں تک محدود کرتی ہے۔ اس طرح یہ مسلمان فقہاء کے موقف سے قریب تر ہو جاتی ہے جو اس معاملے میں افراد کے مذہبی عقائد کو مزید وزن دیتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے مصنفین کے ذہنوں میں معیارات کے درست طور پر واضح ہونے کے باوجود یہ دستاویزات اس صورت حال کو زیر بحث لانے میں ناکام ہوگئی ہیں جہاں ایک اقلیت، معاشرے میں تحفظ کی محتاج ہونے کے بجائے اُس پر عملاً حکمرانی کررہی ہو اور اس کے نتیجے میں اکثریت کے مفادات کہیں زیادہ خطرے میں ہوں۔ ایسے حالات ماضی میں بھی رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔ اس کی بڑی نمایاں مثال جنوبی افریقہ ہے، جہاں چار ملین گوروں نے بتیس ملین کالے اور دو سے تین ملین دوسرے لوگوں پر تین صدیوں سے زیادہ حکومت کی۔ اس سوال کو نظرانداز کرنے یا اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کسی کو نہیں کرنی چاہیے کہ اقلیتوں کے حقوق سے متعلق یہ دستاویزات اُن مظلوم اکثریتوں پر بھی قابل اطلاق ہیں یا نہیں جو جنوبی افریقہ جیسی صورت حال سے دوچار ہوں۔ افریقہ میں آج بھی ایسے ممالک ہیں اور دنیا میں دوسری جگہوں پر بھی ہوسکتے ہیں، جہاں مختلف قسم کی اقلیتیں، اکثریتوں پر حکومت کررہی ہیں۔ تاہم محولہ بالا دستاویزات اس بارے میں یا تو خاموش ہیں یا کروڑوں افراد پر مشتمل مظلوم اکثریتوں کے معاملے میں عملاً غیر متعلق اور غیر مؤثر ثابت ہوتی ہیں۔ اس موضوع کا شامل نہ کیا جانا، فی الحقیقت ان دستاویزات کو تیار کرنے والوں کی جانب سے ایک نمایاں خلاء اور اہم صرفِ نظر ہے۔

اقلیتوں کے حقوق سے متعلق تازہ دستاویزات کی ایک اور کمزوری جسے تھیلی کا ایک اور چھید کہا جاسکتا ہے، یہ واضح نہ ہونا ہے کہ تحفظ کا ضرورت مند قرار پانے کے لیے اقلیت کو کتنا چھوٹا ہونا چاہیے۔ بہت سے لوگ محسوس کرتے ہیں کہ یہ دستاویزات صرف اس صورت حال کو زیرغور لاتی ہیں جہاں کوئی اقلیت اتنی چھوٹی اور اتنے محدود وسائل کی حامل ہو کہ اس کی حفاظت اور اس کے حقوق و مراعات کے تحفظ کے لیے مثبت اقدام یعنی باہر سے اخلاقی اور قانونی مدد ضروری ہو۔ ان دستاویزات میں تجویز کردہ اقدامات ان حالات کے لیے بالکل غیر مؤثر اور ناکافی ہیں جہاں کوئی گروپ عددی اور نسبتی اعتبار سے تو اقلیت ہو مگر اس کا حجم دنیا کے درجنوں ممالک کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہو۔ برصغیر کے بہت سے مسلمان ان دستاویزات کی اس کمی کو محسوس کرتے ہیں۔ بھارت کے مسلمانوں کی آبادی،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

متعدد تخمینوں کی رو سے، پندرہ سے پچیس کروڑ ہے۔ اتنی بڑی اقلیت کی توقعات اور مفادات پر اقلیتوں سے متعلق مختلف دستاویزات میں پوری طرح توجہ نہیں دی گئی ہے۔ بین الاقوامی مباحث اور دستاویزات میں قوم کا لفظ جس مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے، اس کی رو سے بھارتی مسلمان فی الحقیقت تقریباً ایک جداگانہ اور ممتاز قوم ہیں۔ اس کے باوجود وہ ایک ایسے ملک کے شہری ہیں، جس کی غالب آبادی ان سے نسلی اور، بہت سی صورتوں میں، لسانی طور پر ہی نہیں بلکہ بنیادی مذہبی عقائد کے اعتبار سے بھی مختلف ہے۔ اقلیتوں کے موضوع پر موجودہ دور میں جاری مباحث کا یہ ایک نہایت اہم پہلو ہے۔

اقلیتوں سے متعلق معاملات کا جائزہ دو مختلف سطحوں پر لیا جا سکتا ہے، ایک قومی اور دوسرے بین الاقوامی۔ ایک قومی اقلیت کی تعریف شہریوں کے ایک ایسے گروپ کی حیثیت سے کی جا سکتی ہے جو ایک اقلیت کی تشکیل کرتے ہیں اور جن کے حقوق اور مراعات ان کے ملک کے داخلی قانون کی رو سے محفوظ ہیں یا کم از کم انہیں محفوظ تصور کیا جاتا ہے۔ جبکہ ایک بین الاقوامی اقلیت سے مراد ایسا گروہ یا جمعیت ہے جس کے حقوق اور مراعات کی ضمانت بین الاقوامی قوانین وضوابط کے تحت دی جانی چاہیے۔ بلاشبہ ایسے پہلو ہیں یا آئندہ ہو سکتے جنہیں بین الاقوامی اداروں کی جانب سے بین الاقوامی قانون کے تحت وضع کردہ بین الاقوامی دستاویزات/معاہدات کے ذریعے محفوظ کیا جانا چاہیے۔ نیز اب تک بہت سے ایسے دوسرے مسائل اور معاملات بھی باقی ہیں جن سے قومی سطح پر تیار کی گئی دستاویزات اور داخلی قانون سازی کے ذریعے نمٹا جانا چاہیے۔ ان دو طرح کی دستاویزات کے تقاضوں کے درمیان ممکنہ ٹکراؤ کا حل ایک اہم مسئلہ ہے جس نے ذہنوں کو متحرک کیا ہے اور جو اہل دانش اور ماہرین قانون کی توجہ کا محور بنا ہے۔

دلچسپ بات ہے کہ مسلمان علماء اقلیتوں کے مسئلے اور دیگر متعلقہ معاملات کو دونوں سطحوں پر زیر غور لا چکے ہیں۔ ایک سطح بلدیاتی و شہری قانون سازی کی ہے جو دوسرے گروہ کے حقوق سے بحث کرتی ہے جبکہ دوسری سطح اسلام کے بین الاقوامی قانون کی ہے جو اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلموں کے حقوق و مراعات سے متعلق ہے[۲]۔

اقلیتیں اسلامی معاشرے میں

اقلیتوں کے معاملے پر مسلمانوں کے نقطہ نظر کا جائزہ لینے سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلام کی تاریخ میں تکثیریت (متعدد اور مختلف انسانی جمعیتوں کا مل جل کر رہنا) کی مکمل طور پر تشکیل بھی کی گئی اور اسے روبعمل بھی لایا گیا۔ اسلامی نظام قانون، جو داخلی طور پر نافذ رہا اور جس پر بین الاقوامی معاملات میں مسلم حکمراں ایک ہزار سال تک عمل کرتے رہے، پوری طرح تکثیری نظام تھا۔ اس نے مختلف اور متنازع نظریات، متنوع ثقافتوں، اور مختلف پس منظر رکھنے والے لوگوں کو ایک ہی نظام میں کامیابی کے ساتھ سموئے رکھا، جو مختلف گروپوں کی ضروریات اور احتیاجات کو یکساں طور پر پورا کرتا تھا۔

بعض اوقات مسلم دنیا سے باہر کے غیر مسلم مبصرین، اسلام کے موقف اور اسلام کو ایک مذہب اور اخلاقی اصولوں کے مجموعے سے بڑھ کر ایک سماجی ضابطے، ایک قانونی نظام، ایک ثقافتی ماڈل اور ایک تہذیب کی حیثیت سے سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ یہ اسلامی تعلیمات اور قانون شریعت کے نفاذ اور اس پر عمل کے اظہار کی مختلف سطحیں ہیں۔ ان تمام سطحوں کی ضروریات اور ان کے اظہار کے درمیان ایک داخلی توازن موجود ہے۔ یعنی ان مختلف تقاضوں کی کش مکش کے درمیان توازن برقرار رکھنے کی خاطر بالعموم ایک ہم آہنگی قائم رکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

اسلامی تکثیریت کو، اگر یہ اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہو، مسلمان فقہاء نے براہ راست قرآن کی ہدایات اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ عملی نمونے کی روشنی میں فروغ دیا۔ قرآن کسی مخصوص نسلی یا لسانی گروہ یا کسی خاص قبیلے یا معاشرے سے خطاب نہیں کرتا۔ وہ عام طور پر یا تو خود پوری انسانی برادری یعنی آدم کی اولاد، یا مخصوص انسانی گروہوں سے ان کے مذہبی عقائد کے حوالے سے خطاب کرتا ہے۔ قرآن نے کہیں بھی لوگوں کے کسی گروہ کو ان کی نسل، رنگ، زبان یا ایسی کسی اور وابستگی کی بنیاد پر خطاب نہیں کیا۔ یہ چیز قرآن کی نگاہ میں انسانیت کے اتحاد کی اہمیت کی نشان دہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے کے علاوہ اس حقیقت کا اعلان کرتی ہے کہ لوگوں کے درمیان امتیاز صرف ان معاملات کی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے جن کا انتخاب وہ اپنے آزادانہ اور شعوری فیصلے سے کرتے ہیں۔ ان معاملات میں آئیڈیالوجی اور مذہبی عقائد خاص طور پر اہم ہیں۔ نسلی اور لسانی اختلافات اور ذات پات کا انتخاب کسی بھی شخص کی جانب سے آزادانہ یا شعوری طور پر نہیں کیا جاتا۔ یہ معاملات اتفاقی اور فطرت کے فیصلوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس لیے افراد کے ساتھ ان کی بنیاد پر امتیازی سلوک نہیں کیا جانا چاہیے۔

قرآنی حوالوں میں جس مذہبی تکثیریت کی عکاسی ملتی ہے، اس کا جائزہ دو نقطہ ہائے نظر سے لیا جاسکتا ہے۔ ایک نظریاتی حوالہ جو قرآن میں پیش کیا گیا ہے اور دوسرے مسلم معاشروں میں اس پر تاریخی عمل درآمد۔ قرآن ''اہل کتاب'' کو (جن میں بنی اسرائیل اور عیسائی شامل ہیں) خاص طور پر دعوت دیتا ہے کہ ان مشترک بنیادوں پر متحد ہو جائیں جو تمام آسمانی مذاہب کے لیے ہیں، اور پھر اپنے مشترکہ مقصد کے لیے آگے بڑھیں اور انسانیت کی خدمت کریں۔ قرآن کی یہ دعوت پائیدار مذہبی تکثیریت کے لیے حتمی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمان حکمرانوں کی کارکردگی، کئی دوسرے شعبوں میں ناکامی کے باوجود، غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ حسن سلوک کے حوالے سے مثالی رہی ہے۔ یہودی مؤرخوں اور مغربی اہل قلم کی جانب سے تسلیم کیا گیا ہے کہ اپنی بادشاہت کے زوال کے بعد، یہودی تاریخ کے بہترین ادوار وہ تھے جب وہ مسلمان ملکوں میں آباد رہے۔ مسلم اسپین میں وہ مکمل آزادی اور عزت و احترام سے بہرہ ور ہوئے جو ہر انسان کو حاصل ہونی چاہیے۔ عباسیوں کی طرف سے غیر مسلموں کو دیا جانے والا مرتبہ، اور مغلوں اور دوسرے بادشاہوں کی جانب سے ہندوؤں کو دیا جانے والا مقام، اس برتاؤ کی نوعیت کو واضح کرتا اور اس کی مثالیں فراہم کرتا ہے، جو مسلمان معاشروں میں غیر مسلموں کے ساتھ روا رکھا گیا۔

یہاں اس امر کی نشان دہی بھی مناسب ہوگی کہ مسلمان فقہا کی جانب سے ''اقلیت'' کی اصطلاح بیسویں صدی عیسوی سے پہلے استعمال نہیں کی گئی۔ اس بات کی وضاحت مشکل ہے کہ فقہ پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انتہائی وسیع مواد میں کہیں یہ اصطلاح کیوں استعمال نہیں کی گئی۔ یہ تاریخی اور قانونی لٹریچر میں نہیں پائی جاتی۔ یہ مسلمان علمائے دین اور اہل قلم کی تصانیف میں نہیں ملتی۔ اس کے باوجود ان کی جانب سے اسلامی معاشرے میں رہنے والے غیر مسلموں کے حقوق اور مراعات پر پوری تفصیل سے اور تمام پہلوؤں پر گہرے غور وخوض کے ساتھ اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے جس کی ان سے توقع کی جاسکتی تھی۔ ایسا شاید اس لیے ہوا کہ مسلمان ذہن کے لیے لوگوں کی تعداد نہیں بلکہ ان کا انسانی شرف اور انسانی خصوصیات اہم ہیں۔ ہر شخص جس سے کوئی معاملہ کیا جارہا ہے انسان ہے، اس کی عزت اور وقار کا تحفظ کیا جانا چاہیے۔ اس کا احترام بحیثیت انسان کیا جانا چاہیے بلالحاظ اس کے کہ وہ کتنے لوگوں کی نمائندگی کررہا ہے۔ اسی طرح لوگوں کی تعداد کا زیادہ ہونا، ان سے وابستہ کسی شخص کی انسانی خصوصیات میں اضافہ کرتا ہے نہ اس کے برعکس صورت حال اس میں کمی کا سبب بنتی ہے۔

انسانیت کو یہ فوقیت دینے کا عملی نمونہ مدینے میں غیر مسلموں کے ساتھ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے برتاؤ میں نظر آتا ہے۔ ایک بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک یہودی جو آپؐ سے سخت دشمنی رکھتا تھا، اس کی لاش اس کے لواحقین قبرستان لے جارہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اللہ کے رسولؐ فوراً کھڑے ہوگئے، اس طرح آپ نے بحیثیت انسان اس کے لیے احترام کا اظہار کیا۔ کسی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سرگوشی میں یاد دلایا کہ یہ فلاں یہودی کی لاش تھی جو ایسا اور ایسا یعنی آپ کا دشمن تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز میں جواب دیا کہ "کیا یہ ایک انسانی جان نہیں ہے؟"[۳]۔ آپؐ نے واضح طور پر نشان دہی کی ہر شخص احترام کا حق دار ہے اور بحیثیت انسان اس کے حقوق ہیں، قطع نظر اس کے کہ اس کا مذہب، نظریات، ثقافت یا نسلی شناخت کیا ہے۔

جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی جانب سے کیا گیا، وہ بحیثیت مجموعی شریعت کا حصہ ہے اور اس بناء پر اسلامی قانون کا ایک ماخذ ہے۔ اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں کے معاملے میں رسول کریم اور آپ کے ساتھیوں نے جو رویہ اور جو طریقے اختیار کیے، وہ قانون کے اہم ماخذ قرار پائے اور انہوں نے وہ بنیاد فراہم کی جس پر اسلام کے نجی بین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الاقوامی قانون کی عمارت تعمیر ہوئی۔

مسلمان معاشروں میں غیر مسلم بالکل ابتداء ہی سے رہتے بستے آئے ہیں۔ فی الحقیقت اسلامی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں جس میں مسلم اکثریت کے ساتھ ساتھ غیر مسلم، ان کے ہم وطنوں کی حیثیت سے آباد نہ رہے ہوں۔ علمائے اسلام نے اُن کی درجہ بندی دو زُمروں میں کی ہے۔ ایک معاہدین اور دوسرے اہل الذمہ۔

معاہدین سے مراد اسلامی ریاست کے وہ غیر مسلم شہری ہوتے تھے جنہوں نے مسلمان حکومت کے ساتھ کوئی خصوصی معاہدہ یا سمجھوتہ کر رکھا ہو۔ اس معاہدے یا سمجھوتے کی بنیاد پر وہ اسلامی ریاست کی شہریت قبول کرتے تھے۔ مثال کے طور پر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے ہجرت کی، جس کی دعوت انہیں شہر کے نومسلموں نے دی تھی، اور مدینے میں ایک شہری حکومت قائم کی تو مدینے کے یہودیوں کے ساتھ آپ نے ایک مفاہمت کی۔ مقامی سرداروں کے مشورے سے ایک دستاویز تیار کی گئی جس میں تمام قبائلی گروپوں، یہودیوں، مدینے کے مقامی باشندوں اور مکے سے آنے والے مہاجروں کے حقوق و مراعات کی وضاحت کی گئی تھی۔ اس دستاویز کو دورِ حاضر کے بعض اسکالر انسانی تاریخ کا پہلا تحریری آئین تصور کرتے ہیں[۴]۔ یہ دستاویز ہم تک پہنچی ہے اور اس کے انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اردو اور ترکی تراجم بھی دستیاب ہیں۔

اس طرح معاہدین غیر مسلموں کی ایسی جماعت ہیں جن کے حقوق اور مراعات کا تعین، قرآن اور حدیث میں دیے گئے حقوق و مراعات کے علاوہ ان کے ساتھ طے پانے والے معاہدے اور سمجھوتے کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ غیر مسلم آبادیاں جو مصر، عراق، شام وغیرہ سمیت تقریباً تمام مسلمان ملکوں میں پائی جاتی ہیں، اس زُمرے میں آتی ہیں۔ ان کے حقوق و مراعات کا تعین، قرآن و سنت کی ہدایات کی روشنی میں کیے جانے کے علاوہ، اس معاہدے، میثاق یا سمجھوتے کے تحت کیا جاتا ہے جو ان کی جماعتوں اور متعلقہ مسلمان حکومت کے مابین طے پاتے ہیں۔ یہ سمجھوتہ ان ممالک کے دساتیر، اور متعلقہ قائدین کے بیانات و اعلانات اور دیگر دستاویزات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں منعکس ہوتا ہے۔

مسلم ریاست کے غیر مسلم شہریوں کی دوسری قسم کو بعض اوقات سطحی قارئین کی جانب سے غلط سمجھا جاتا اور بسا اوقات اہل قلم کی طرف سے اس کی غلط تشریح کی جاتی ہے۔ اس قسم میں وہ غیر مسلم شامل کیے جاتے ہیں جو جنگ میں اپنی شکست اور نتیجتاً اپنے علاقے پر مسلمانوں کے قبضے کے سبب اسلامی ریاست کے شہری بنتے ہیں۔ یہ قسم صرف ماضی میں ہوا کرتی تھی۔

آج کے مسلمان ملکوں میں اس قسم کے غیر مسلم شہریوں کے نہ پائے جانے کے باوجود قرآن اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے استعمال کی گئی اس اصطلاح کی اہمیت کو سمجھنا، اس بارے میں علم میں اضافے کا سبب ہوگا۔ اہل ذمہ کا مطلب ہے وہ شہری جنہیں ضمانت دی گئی ہے۔ یعنی جن کے تحفظ اور دفاع کی یقین دہانی مسلمان شہریوں اور ریاست کی طرف سے کرائی گئی ہے۔ یہ ضمانت اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر دی جاتی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں سے کیے گئے اس عہد و پیمان کی تکمیل کے معاملے میں انتہائی حساس تھے۔ اس عہد کو افراد یا حکمرانوں کی جانب سے نہیں بلکہ بجا طور پر قرآن اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔

غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے معاہدوں اور سمجھوتوں کی بہت سی مثالیں ہیں۔ اگرچہ یہ تمام معاہدے مثالی قدر و قیمت کے حامل ہیں تاہم ان میں سے دو غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں اور بہت مدت تک مسلمان فقہاء میں غور و فکر اور تبادلہ خیال کا اہم موضوع رہے ہیں۔ ان میں سے ایک میثاق مدینہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا، اور دوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے نجران کے لوگوں کے لیے تیار کیا گیا معاہدہ ہے۔ نجران جہاں عیسائیوں کی خاصی تعداد آباد تھی، سعودی عرب کی جنوب مغربی سرحد کے قریب، جو آج یمن ہے، واقع تھا۔ اس معاہدے یا میثاق میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے قبائل کو بنیادی آزادیوں کی ضمانت دی تھی، اور اِن امور کی ذمہ داری لی تھی کہ: ۱) ان کے جو بھی طور طریقے اور رسوم و رواج چلے آرہے ہیں، انہیں کبھی تبدیل نہیں کیا جائے گا، ۲) ان کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو بھی حقوق و مراعات ہیں، انہیں کبھی ردوبدل کا ہدف نہیں بنایا جائے گا، ۳) ان کے مذہبی معاملات جس طرح چل رہے تھے، اسی طرح چلتے رہیں گے۔

یہ دستاویز بھی، جو بہت طویل نہیں، ہم تک پہنچی ہے، اور اس کے انگریزی، فرانسیسی، اردو اور ترکی تراجم بھی دستیاب ہیں ۵۔ یہ قانونی دستاویز، ایسی ہی دیگر دستاویزات کے ساتھ مل کر، جن میں وہ بھی شامل ہیں جن کی تیاری نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں یعنی خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی جانب سے عمل میں آئی، اُن قانونی اختلافات کے حل کی بنیاد فراہم کرتی ہیں جو بعد کے ادوار میں اسلام کے نجی بین الاقوامی قانون کو پروان چڑھانے والے مسلم فقہاء کے درمیان واقع ہوئے۔

چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک قول کی رُو سے، جو پہلے باب میں نقل کیا جاچکا ہے اور کئی ممتاز فقہائے اسلام نے جس کے حوالے دیے ہیں، غیر مسلم شہریوں کے حقوق اور مراعات مسلمانوں کے اپنے حقوق و مراعات کے مماثل ہیں ۶۔

ایک عام اصول جس پر تمام مسلم فقہاء متفق ہیں، یہ ہے کہ کسی غیر مسلم کو ایک بار جو سہولت یا حق دے دیا جائے، اسے اس کے مفادات کے برعکس کبھی واپس لیا جاسکتا نہ تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ ایک ریاست آئین بدل سکتی ہے، اپنے قوانین میں تبدیلی کرسکتی ہے، حتیٰ کہ اسلامی قوانین میں بھی اجتہاد کی بنیاد پر ترمیم و اصلاح ممکن ہے، لیکن جو سہولت کسی غیر مسلم کو ایک بار دے دی جائے، اسے واپس نہیں لیا جاسکتا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ کسی غیر مسلم کو کوئی سہولت دی گئی اور مسلمان حکمرانوں کی طرف سے چھ یا سات صدیوں تک مسلسل اس کو باقی رکھا گیا اور اس کی حفاظت کی گئی۔

مسلم بین الاقوامی قانون پر اتھارٹی کی حیثیت رکھنے والی موجودہ دور کی ایک شخصیت نے اسلامی ریاست کے مسلمان شہری کے مرتبے کا غیر مسلم شہری کے مرتبے سے تقابل کیا ہے۔ اس تقابل سے انہوں نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ ہے کہ کئی اعتبار سے غیر مسلم شہری اپنے مسلمان ہم وطنوں سے بہتر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتا ہے۔ مثلاً زکوٰۃ فرض ہے اور ہر صاحب نصاب مسلمان کو ہر حال میں ادا کرنا ہوتی ہے۔ کسی بھی صورت میں اُسے اِس سے چھوٹ مل سکتی ہے نہ اِس میں کمی ہوسکتی ہے۔ جبکہ ایک غیر مسلم جوز کوٰۃ نہیں دیتا، وہ جزیے کی ادائیگی سے، جو زکوٰۃ کے متوازی ایک ٹیکس ہے اور غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا ہے، ہمیشہ استثنیٰ حاصل کرسکتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی مسلمان ریاست میں لازمی فوجی بھرتی یا فوجی تربیت کا فیصلہ کیا جائے تو کوئی مسلمان اس معاملے میں چھوٹ نہیں پاسکتا جبکہ غیر مسلم مستثنیٰ ہوتا ہے البتہ رضا کارانہ طور پر اس کی طرف سے اس مقصد کے لیے خدمات پیش کی جائیں تو اس کا خیر مقدم کیا جاتا ہے[7]۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بعض غیر مسلم قبائل کو دی گئی ایک اور سہولت بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انہیں یقین دہانی کرائی گئی کہ اگر وہ محسوس کریں کہ ان کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے ریاست کے نمائندے کے طور پر ان کے اپنے لوگوں کو مقرر کیا جانا چاہیے تو کسی مسلمان کو اس منصب کے لیے تعینات نہیں کیا جائے گا۔ اس قسم کے حقوق معاہدوں کے ذریعے دیے گئے تھے۔ فتح مکہ کے بعد ایسی ہی ایک رعایت موجودہ سعودی عرب کے شہر طائف میں آباد ایک قبیلے کو دی گئی تھی۔ طائف مسلمان علاقے کا حصہ بن گیا تھا اس کے باوجود یہ رعایت برقرار رکھی گئی۔

غیر مسلموں کے شخصی قانون کو اسلامی ریاست کی جانب سے ہمیشہ تحفظ مہیا کیا گیا[8]۔ یہ حق ان معاملات میں بھی تسلیم کیا جاتا ہے جن میں اسلامی قانون کسی عمل کو معتبر یا اخلاقی طور پر جائز قرار نہیں دیتا۔ مثال کے طور پر بعض غیر مسلم ایسے افعال کا ارتکاب کرتے ہیں جو اسلام ہی میں نہیں، بیشتر انسانی معاشروں میں مکروہ سمجھے جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ستی کی رسم ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت سے پہلے سے جاری تھی اور اس ملک کے بعض علاقوں میں اس پر اب تک عمل کیا جاتا ہے۔ اس مذہبی رسم کی رو سے، اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی موت کے نتیجے میں بیوہ ہوجائے تو اس کے لیے شوہر کے بعد زندہ رہنے سے بہتر طریقہ اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ جل کر مرجانا سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں مسلم اقتدار کے دوران اگرچہ مسلمان علماء اور ماہرین قانون نے ہندوؤں کو اس رسم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے روکنے کی کوشش کی مگر مسلمان حکومت نے قانون اور طاقت کے ذریعے اس مقصد کے لیے کوئی مداخلت نہیں کی۔

اس طرح جب آج کے ایران کے علاقے اسلامی خلافت کا حصہ بنے، اس وقت وہاں بہت سے ایسے لوگ تھے جو ان رشتوں کے درمیان ازدواجی تعلق میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے، اسلام اور دیگر آسمانی مذاہب نے جن کے مابین نکاح کو حرام قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود مسلمان حکمرانوں نے ان کی ان سرگرمیوں میں کوئی مداخلت نہیں کی اور غیر مسلم ایرانیوں نے اس سلسلے کو قائم رکھا۔ باور کیا جاتا ہے کہ ایران میں آتش پرستوں کی بہت چھوٹی سی اقلیت میں یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ آج کے پاکستان اور بھارت میں بھی اس گروہ کے لوگ بہت تھوڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ بہرحال مسلم حکمرانوں کی طرف سے ان کے اس طریقے کو بند کرانے کے لیے کبھی مداخلت نہیں کی گئی۔ اِس سے اُس انتہاء کا پتہ چلتا ہے جہاں تک غیر مسلموں کے شخصی قانون کو مختلف مسلم ملکوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں غیر مسلموں کے مقام کو مسلمان فقہاء نے مختصراً ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''جہاں تک سماجی امور اور اس دنیا کے معاملات کا تعلق ہے تو غیر مسلم بھی مسلمانوں ہی کی مانند ہیں''[۹]۔ لہٰذا جائیداد اور مال و دولت کے لحاظ سے جو کچھ مسلمان کے لیے روا ہے وہ غیر مسلم کے لیے بھی روا ہے، اور اس ضمن میں جو کچھ مسلمان کے لیے جائز نہیں غیر مسلم کے لیے بھی اس کی اجازت نہیں ہے۔

اگر ہم تحمل اور دوسروں کے لیے گنجائش پیدا کرنے کی اسلامی روایت کا موازنہ آج کے مختلف ''مہذب'' ملکوں میں ان کے شخصی قانون کے حوالے سے مسلمانوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے برتاؤ سے کریں، تو ہمیں زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ یہ بات انتہائی افسوس ناک ہے کہ متعدد جدید اور ''جمہوری'' ملکوں میں مسلمانوں کے معاملات میں اسلام کے شخصی قانون کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ بعض ملکوں میں ایسی آئینی پابندیاں ہیں جو مسلمانوں کو شادی بیاہ اور دوسرے امور سمیت اپنے ذاتی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خاندانی معاملات کو قرآنی تعلیمات کے مطابق منظم کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔

غیر مسلم ملکوں میں مسلمان اقلیتیں

دور حاضر میں غیر اسلامی ماحول میں زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ دنیا کے تقریباً ایک ارب چالیس کروڑ مسلمانوں میں سے ۳۵ سے ۴۰ فی صد مسلم دنیا سے باہر بستے ہیں۔ یہ کوئی نئی صورت حال نہیں۔ مختلف غیر مسلم ملکوں میں مسلمان اقلیتیں بالکل شروع ہی سے رہتی بستی چلی آرہی ہیں۔ اس کی سب سے قدیم مثال حبشہ (ایتھوپیا) ہے۔ جیسا کہ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی برسوں میں جب مکہ کے مسلمان شدید مظالم کا نشانہ بنے ہوئے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان پیروؤں کو جو جبر و ستم سے سب سے زیادہ متاثر تھے، حبشہ ہجرت کر جانے کا مشورہ دیا۔ آپؐ نے انہیں بتایا کہ اس ملک پر ایک خداترس فرمانروا کی حکومت ہے، اس کی قلمرو میں ان کے ساتھ کوئی غلط سلوک نہیں ہوگا کیونکہ وہاں کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہوتی۔ اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حبشہ ہجرت کر کے وہاں رہائش اختیار کر لی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو حبشہ کے لوگوں کے ساتھ کسی اختلاف میں نہ پڑنے کی ہدایت بھی کی۔ کئی محدثین کی روایت کے مطابق آپ کی اس ہدایت کے الفاظ یہ تھے: ''حبشہ کے لوگوں کو اس وقت تک تنہا چھوڑے رکھو جب تک وہ تمہیں تنہا چھوڑے رکھیں۔''[۱۰] مطلب یہ ہے کہ حبشہ کے لوگوں کے لیے انہیں ایک غیر جانبدارانہ طرز عمل اختیار کرنا تھا، ان کے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کرنی تھی، ان پر کبھی حملہ نہیں کرنا تھا، اور ان کے ساتھ کبھی کوئی دشمنی مول نہیں لینی تھی۔

یہ مہاجر حبشہ میں امن کے ساتھ آباد رہے اور ان کی نسل کے لوگ آج بھی وہاں پائے جاتے ہیں، اس کے باوجود حبشہ کبھی مسلم دنیا یا کسی اسلامی ریاست کا حصہ نہیں رہا، نہ آج اسلامی مملکت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی پاسداری نہ صرف مہاجرین کی طرف سے کی گئی بلکہ خطے کے تمام مسلم حکمرانوں نے بھی ہر دور میں اسے ملحوظ رکھا اور اس ہدایت کا لحاظ آج

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تک کیا جارہا ہے۔ پوری اسلامی تاریخ میں ہم کوئی ایسی مثال نہیں پاتے جس میں مصر، سوڈان یا دوسرا کوئی ملحقہ ملک، حبشہ میں مسلمانوں کے ساتھ شدید مظالم کی کئی مثالوں کے باوجود جس میں سے ایک ہیل سلاسی کا دور بھی ہے، وہاں کے حکمرانوں کے ساتھ کسی قسم کی دشمنی میں الجھا ہو۔

مسلمان اقلیتیں تین اقسام میں بانٹی جا سکتی ہیں۔[11] پہلی قسم ان مسلمان اقلیتوں کی ہے جو ماضی کی مسلمان سلطنتوں اور آزاد علاقوں کی نمائندگی کرتی ہیں جنہیں بعد میں یا تو پڑوسی غیر مسلم طاقتوں کی جانب سے اپنے حدود میں شامل کرلیا گیا یا جن پر قبضہ کرلیا گیا۔ جنوبی فلپائن (منڈاناؤ) کے مسلمانوں کی ایک زمانے میں اپنی سلطنت تھی۔ انہیں بعد میں ایک غیر مسلم پڑوسی طاقت نے اپنے حدود میں شامل کرلیا۔ ہندوستان اور یورپ کے بعض علاقوں کے مسلمان بھی اسی قسم کی مسلمان آبادیوں کی مثال ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ مختلف غیر مسلم حکومتوں کا ہدف بن گئیں۔ ایسی مسلمان اقلیتیں عددی اعتبار سے سب سے بڑی ہیں۔

مسلمان اقلیتوں کی یہ پہلی اور شاید سب سے زیادہ مسائل میں گرفتار قسم ہے۔ ان مسلمانوں کو جس سب سے بڑے مسئلے کا سامنا ہے وہ اپنی اسلامی شناخت کا تحفظ ہے۔ وہ اپنے آپ کو اقلیت کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں کہ ان کی قسمت کا حتمی فیصلہ اس حقیقت کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ اس مسئلے کا حل بالآخر کیا ہوگا، یہ ابھی طے ہونا باقی ہے۔

مسلمان اقلیتوں کی دوسری قسم میں وہ تارکین وطن شامل ہیں جو غیر مسلم ملکوں، عام طور پر یورپ اور شمالی امریکا میں پرکشش معاشی مواقع یا دیگر اسباب کی بناء پر گئے تھے مگر پھر وہیں بس گئے۔[12] ان تارکین وطن کی ایک بڑی تعداد بحیثیت طالب علم اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ان ممالک میں پہنچی اور اپنے اصل ملکوں کو واپس نہیں لوٹی۔ یہ لوگ اب مسلمان اقلیتوں کا ایک بڑا حصہ ہیں اور ان کی تعداد دسیوں لاکھ تک پہنچتی ہے۔ مسلمان اقلیتوں کی یہ قسم بالعموم میزبان معاشروں کے طور طریقوں، قوانین اور سماجی نظم وضبط کی پابند ہے اور بحیثیت مسلمان اپنی شناخت کھوئے بغیر مقامی نظام میں مدغم ہوگئی ہے۔ عام طور پر یہ مسلمان اپنے میزبان ملکوں کے لیے کسی مشکل یا مسئلے کا باعث نہیں ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمان اقلیتوں کی تیسری قسم دنیا کے مختلف حصوں میں اسلام قبول کرنے والے لوگوں پر مشتمل ہے۔ ان کا بنیادی مسئلہ اسلامی شناخت کا حصول اور اس کا برقرار رکھنا ہے۔ اپنے بچوں کی اسلامی طور طریقوں کے مطابق تعلیم وتربیت اور پرورش و پرداخت ان کے لیے سب سے کٹھن چیلنج ہے۔ بہت سے کیسوں میں ان کی اسلامی شناخت تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتا رہا ہے۔ بعض واقعات ایسے بھی ہیں جن میں باقاعدہ طور پر ان کی اسلامی حیثیت کو ماننے سے انکار تو نہیں کیا گیا مگر مجموعی ماحول ان کے لیے اسلامی شناخت کے حاصل کرنے اور قائم رکھنے کو مشکل بناتا ہے۔

ایک اہم معاملہ جس کا غیر مسلم ملکوں میں مقیم مسلمان اقلیتوں کو سامنا کرنا پڑتا ہے، یہ غلط فہمی ہے کہ وہ اپنی زندگیوں میں شریعت کو بالکل اسی طرح نافذ کرنے کے پابند ہیں جس طرح مسلمان ملکوں میں رہنے والے مسلمان اس کے مکلف ہیں۔ یہ غلط فہمی جو شریعت اور میزبان ملک کے طور طریقوں اور قوانین وضوابط کے درمیان غیر ضروری طور پر تنازع پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے، بعض کم تعلیم یافتہ یا بے حد جذباتی تحریکی کارکنوں نیز ایسے غیر مسلم مبصرین کی پیدا کردہ ہے جو اس بات سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے کہ اپنے مختلف زُمروں کے پیروؤں سے اسلام کے مطالبات کیا ہیں۔

فی الحقیقت مسلم معاشرے میں رہنے والے ایک مسلمان سے اسلام کا مطالبہ، ایک غیر مسلم ماحول میں رہنے والے مسلمان سے کیے جانے والے مطالبے سے مختلف ہے۔ اسی طرح خود اپنی حکومتوں میں مسلمان جس حد تک سیاسی آزادی اور خود مختاری رکھتے ہیں، وہ ان ذمہ داریوں کا درست طور پر تعین کرتی ہے جو اسلام کی طرف سے ان پر عائد ہوتی ہیں۔[۱۳]

اس سے واضح ہے کہ اگر مختلف حالات اور مختلف سیاق وسباق کے مطالبات کو خلط ملط کر دیا جائے اور ہر شخص سے ایک ہی ضابطے کی پابندی کرنے کو کہا جائے تو اس رویے سے الجھاؤ اور مشکلات جنم لیں گی۔ یہ خیال کہ اسلام کے مطالبات بدلے ہوئے حالات میں بدل سکتے ہیں، کسی مداہنت یا سمجھوتے کا مظہر نہیں، اس کی بنیاد خود قرآن میں موجود بعض اصولوں پر ہے۔ قرآن میں کئی ہدایات ہیں جن میں مسلمانوں سے کوئی کام کرنے کا مطالبہ مخصوص حالات وشرائط کی موجودگی ہی میں کیا گیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ اگر وہ مخصوص حالات وشرائط موجود ہوں، مطالبہ تب ہی قابل عمل ہوگا۔ اگر پیشگی شرائط موجود نہ ہوں، تو مطالبہ قابل عمل نہیں سمجھا جائے گا۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص سال بھر مال کی ایک خاص مقدار بچانے کا اہتمام کرتا ہے، تو اس رقم پر اڑھائی فی صد کی شرح سے زکوٰۃ کی ادائیگی فرض ہے کیونکہ یہ ایک لازمی ٹیکس ہے۔ زکوٰۃ اسلام کا ایک بنیادی رکن ہے اور ہر مسلمان کے لیے اسے ماننا ضروری ہے۔ اس کے باوجود اس پر عمل صرف اسی شخص کو کرنا ہے جس پر اس کی شرائط لاگو ہوتی ہوں۔ لہٰذا ایک مسلمان اگر غریب ہے اور اپنی حقیقی ضروریات سے زائد اتنی رقم پورے ایک سال تک بچائے رکھنے کے قابل نہیں ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، تو اس پر زکوٰۃ کا فریضہ عائد نہیں ہوتا۔ اس استثنا کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام کا مطالبہ بدل گیا ہے یا ایک اسلامی اصول پر سمجھوتہ کرلیا گیا ہے۔ سادہ طور پر بات صرف اتنی ہے کہ چونکہ مطلوبہ شرائط موجود نہیں اس لیے متعلقہ شخص پر اس حوالے سے ذمہ داری بھی عائد نہیں ہوتی۔

اسی طرح قادر مطلق نے مسلمانوں کو اس صورت میں کچھ مخصوص فرائض ادا کرنے کا حکم دیا ہے جب قرآن کے الفاظ میں ''اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخشیں۔''[۱۴] کی صورت حال پیدا ہو جائے۔ اس کا مطلب ہے کہ ان ذمہ داریوں کی ادائیگی حکمرانی کے اختیار سے مشروط ہے۔ ایک مسلمان اقلیت سے بعض ایسے اسلامی احکام پر عمل کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا جو مدینے میں نافذ کیے گئے تھے۔ مدینے میں اسلام کے نظام تعزیر پر عمل کیا جاتا تھا لیکن دور رسالتؐ میں حبشہ کی مسلمان اقلیت سے اس ضابطے پر عمل کرنے کا مطالبہ کبھی نہیں کیا گیا۔ یہی صورت دوسرے خلیفہ راشد کے دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کی چھوٹی سی اقلیت اور تیسرے خلیفہ راشد کے عہد میں اسپین کی مسلمان اقلیت کے معاملے میں روا رکھی گئی۔ اس سے بخوبی واضح ہے کہ اپنے پیروؤں سے اسلام کے مطالبات متعلقہ سیاق وسباق اور حالات کے تحت مختلف ہوتے ہیں، اور غیر مسلم ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں پر بعض معاملات میں مسلمان ممالک میں رہنے والے مسلمانوں سے مختلف قوانین لاگو ہوتے ہیں۔

مزید یہ کہ اسلامی قانون میں ایسے ضابطے اور اسلامی علم قانون میں ایسے اصول ہیں جو صرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمانوں کا امام یا اسلامی ریاست یا اسلامی حکومت ہی نافذ کر سکتی ہے۔ یہ اصول وقواعد شریعت کے ایک اہم حصے کی تشکیل کرتے ہیں مگر ان کے نفاذ کی ذمہ داری فرد پر نہیں ہے۔ غیر مسلم ماحول میں رہنے والے نوعمر مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو اس فرق سے واقف کرایا جانا چاہیے۔ اس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ افراد صرف ان امور اور ذمہ داریوں کی ادائیگی کے پابند ہیں جن کا مطالبہ فرد سے کیا گیا ہے۔[۱۵] یہ نکتہ ان غیر تعلیم یافتہ نیز ان غیر مسلم خیر خواہوں اور مبصرین کو بھی سکھایا جانا چاہیے جو اسلام کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر نہیں ہیں۔

یورپ اور امریکا میں آج یہ معاملہ تشویش کا باعث ہے کہ وہاں رہنے والے مسلمان حدود وقوانین کا نفاذ شروع کر سکتے ہیں۔ اس کا حل کیا ہونا چاہیے؟ سیدھا سا جواب یہ ہے کہ قرآن امریکا یا کسی بھی دوسرے غیر مسلم ماحول میں مسلمانوں سے حدود کے نفاذ کا مطالبہ نہیں کرتا کیونکہ اسلام کے نظام تعزیرات کا نفاذ افراد کا کام نہیں ہے۔ اس کا مطالبہ مسلمان ریاست سے کیا گیا ہے۔ صاحبان اختیار ہی ان قوانین کے نفاذ کے ذمہ دار ہیں۔ فی الحقیقت حدود اور دوسری شرعی سزائیں کبھی افراد کے ذریعے نافذ نہیں ہوتی ہیں خواہ وہ مسلمان ملک میں رہتے ہوں یا کسی غیر مسلم ماحول میں۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان اقلیتوں اور ان کے غیر مسلم میزبانوں کو جن مشکلات کا سامنا ہے، اس کی وجہ اسلام کے ان تقاضوں کے بارے میں الجھاؤ اور غلط فہمی ہے جو غیر مسلم ماحول میں رہنے والے مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں۔ یہ شعور کہ اسلام کے بہت سے مطالبات کا انحصار فرد کے حالات اور سیاق وسباق پر ہے، ان مسائل سے نمٹنے میں مددگار ہو سکتا ہے۔

اقلیتیں پاکستان میں

پاکستان میں غیر مسلم سماجی اور سیاسی سطح پر کسی مشکل یا مسئلے کا سامنا کیے بغیر امن کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ انہیں دیے گئے حقوق اور ضمانتوں کو آئین پاکستان میں تحفظ مہیا کیا گیا ہے۔ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ بار بار یہ یقین دہانی کراتے رہے کہ پاکستان میں غیر مسلموں کو وہی حقوق اور سہولتیں حاصل ہوں گی جن کی ضمانت شریعت ان کے مسلمان ہم وطنوں کو دیتی ہے۔ قائد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اعظم کی ریکارڈ پر موجود یہ یقین دہانی چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بیان کردہ اس اسلامی اصول کے عین مطابق ہے جس کا ذکر سطور بالا میں کیا جا چکا ہے۔

پاکستان کے قیام سے پہلے بھی اور اس کے فوراً بعد بھی، قائداعظم نے غیر مسلموں کو یقین دلایا کہ انہیں عبادت کی مکمل آزادی حاصل ہوگی اور وہ اپنے مذہب پر عمل کا سلسلہ پہلے ہی کی طرح جاری رکھ سکیں گے۔ وہ اسی طرح آزاد و خود مختار ہوں گے جیسے پاکستان کے باقی شہری ہوں گے۔ گیارہ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی سے اپنے خطاب میں انہوں نے کہا: ''آپ اپنے مندروں میں جانے کے لیے آزاد ہیں، آپ اپنی مسجدوں میں جانے کے لیے آزاد ہیں، آپ کسی بھی عبادت کی جگہ جانے کے لیے آزاد ہیں۔ یہاں مذہب کی وجہ سے کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔ پاکستان میں سارے شہری یکساں ہوں گے، اور جہاں تک شہریت اور بحیثیت پاکستانی ان کے حقوق اور مراعات کا تعلق ہے، ان کے درمیان مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کی جائے گی۔''

اس بیان کے چند روز بعد قائد نے ایک پریس کانفرنس طلب کی جس میں انہوں نے اس یقین دہانی کی مزید وضاحت کی کیونکہ اسمبلی کے سامنے ان کے بیان کے اس حصے کو متعدد بار غلط طور پر پیش کیا گیا تھا۔ فی الحقیقت اس وقت سے اب تک یہ الفاظ اکثر سیاق و سباق سے بالاتر ہو کر پیش کیے جاتے ہیں، حالانکہ قائد نے اپنے بیان کی خود یہ وضاحت کر دی تھی کہ پاکستان کے غیر مسلم ان حقوق کے حامل ہوں گے جو انہیں اسلام نے عطا کیے ہیں۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے افتتاح کے موقع پر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو انہوں نے کہا تھا: ''جس تحمل و رواداری اور خیر خواہی کا مظاہرہ شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ کیا تھا وہ کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ یہ تیرہ سو سال پرانی بات ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف الفاظ سے نہیں، اپنے عملی اقدامات سے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ، انہیں فتح کرنے کے بعد، یہی برتاؤ روا رکھا تھا۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ، جب بھی انہوں نے حکمرانی کی، فراخدلی اور حسن سلوک کے عظیم اصولوں پر عمل درآمد کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان کی پیروی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان پر عمل کیا جانا چاہیے۔"[16]

قائد کی وفات کے بعد جلد ہی اس ملک کے بانی اکابر، اس کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے ارکان نے ایک قرارداد منظور کی جو "قرارداد مقاصد" کے نام سے معروف ہے۔ قرارداد مقاصد بیسویں صدی میں مسلمانوں کی آئینی تاریخ کی اہم ترین دستاویزات میں سے ایک ہے۔ اس قرارداد میں پہلی بار، اسلامی احکام اور اسلام کے آئینی نظریے کے اصولوں، اسلام کے سیاسی فلسفے کی بنیادی عناصر، اور عوامی نمائندگی پر مبنی جدید جمہوری نظام کے ضوابط کو یکجا کردیا گیا ہے۔ یہ سب مساوی اہمیت اور خوبصورتی کے ساتھ ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ یہ اہم دستاویز پاکستان کے تمام دستوری مسودوں کا حصہ رہی اور آج دفعہ دو الف کے ذریعے آئین پاکستان کے قابل نفاذ حصے میں شامل ہے۔ اقلیتوں کے حوالے سے اس میں کہا گیا ہے کہ انہیں اپنے مذہب پر عمل کرنے، اپنی ثقافت کو پروان چڑھانے، اپنی زبانوں کو ترقی دینے اور ان تمام حقوق سے مستفید ہونے کی مکمل آزادی ہوگی جو دوسرے شہریوں کو حاصل ہوں گے۔

یہ پہلی آئینی ضمانت تھی جو پاکستان میں اقلیتوں کو دی گئی۔ مزید ضمانتیں بھی دستور میں دی گئی ہیں جو بنیادی حقوق سے متعلق ہیں اور صاف طور پر واضح کرتی ہیں کہ ہر شہری کو بلا لحاظ ذات، نسل اور ثقافت، ان حقوق کی ضمانت دی جائے گی۔

دستور کے بارھویں حصے میں، جہاں اسلامی شقیں درج کی گئی ہیں، اور جہاں کہا گیا ہے کہ تمام قوانین قرآن وسنت کے مطابق بنائے جائیں گے اور قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون نافذ نہیں کیا جائے گا، وہاں یہ وضاحت بھی کردی گئی ہے کہ یہ شق غیر مسلموں کے مرتبے اور حقوق اور پاکستان کے شہری کی حیثیت سے ان کے شخصی مقام پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ یہ شق آئین کی دفعہ ۲۲۷ میں بھی، جہاں اسلامی قوانین کے نفاذ کے آئینی عزم کا اظہار کیا گیا ہے، شامل کی گئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اقلیتیں، جن میں سب سے بڑی اقلیت عیسائی اور پھر ہندو ہیں، اس ملک میں ہمیشہ آزادی، عزت اور استحقاق سے بہرہ مند رہی ہیں۔ ایک عیسائی ماہر قانون اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملک کے اعلیٰ ترین عدالتی منصب یعنی چیف جسٹس آف پاکستان کے عہدے تک پہنچا، اور ملک کی اعلیٰ عدالتوں میں نہایت وسیع پیمانے پر قابل احترام شخصیت رہا۔[۱۷] اسی طرح سپریم کورٹ آف پاکستان کے ایک ہندو جج حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں، اور اب حکومت پاکستان کے فیڈرل پبلک سروس کمیشن کی سربراہی کرر ہے ہیں[۱۸]۔ وہ سپریم کورٹ کی تاریخ کے ان نہایت معزز ججوں میں شامل ہیں جن کا بہت بڑے پیمانے پر احترام کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں ان کے علاوہ بھی دوسرے بہت سے غیر مسلم جج، سرکاری افسر اور کاروباری اشخاص رہے ہیں جنہیں ان کی اعلیٰ صلاحیتوں اور قومی مقاصد سے وابستگی کی بناء پر ہمیشہ انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

حاصل کلام

اقلیتوں کے معاملے میں اسلام کے احکام سے مسلمان اور غیر مسلم دونوں بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ان کی رو سے کسی شخص کو نسل، رنگ روپ یا زبان کی وجہ سے مختلف تصور نہیں کیا جانا چاہیے، اس کے بجائے عقیدے اور کردار کو کسی فرد کی شخصیت اور مقام کے تعین کی کسوٹی ہونا چاہیے۔ ان ہدایات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ افراد کی جانب سے مختلف مذاہب کے انتخاب کے باوجود ہر شخص کا انسانی برادری کے رکن کی حیثیت سے احترام کیا جانا چاہیے اور اس کے حقوق محض اس وجہ سے پامال نہیں ہونے چاہئیں کہ وہ اختلاف کی جرأت رکھتا ہے۔ ریاستی نظام کے موجودہ سیاق و سباق میں پاکستان، انسانیت کی بنیاد پر قومی یگانگت اور باہمی تعاون کا ایک مثالی نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس میں بہتری کی بڑی گنجائش ہے تاہم پاکستانی معاشرہ اور قانون تمام مسالک، نسلی جمعیتوں اور لسانی گروپوں کے تمام مسلمانوں کو یکساں مواقع فراہم کرتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تبصرے اور تبادلۂ خیال

انتونیو سیگورا موریس: ۱۹ عالم گیریت کے تیز رفتار عمل میں اطلاعاتی انقلاب پوری دنیا کی اقلیتوں کو منظر عام پر لے آیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ علمی اور اخلاقی ارتقاء نے انسانی معاشرے میں غیر ملکیوں کو مقامی ثقافتوں میں سمونے کی خاطر سازگار حالات فراہم کرنے کے رجحان کو ایک پسندیدہ عمل کی حیثیت سے وسعت دی ہے۔ مغرب میں حکومتیں سماجی اتحاد کے انسانی تصور کو معاشرے کی بنیاد بنانے کی ضرورت کی تیزی سے قائل ہو رہی ہیں۔ ذات پات، نسل اور ثقافت جیسی باہمی ادغام کی ابتدائی بنیادیں، افکار و خیالات کی اساسی شناخت اور انسانی فطرت کی حصہ داری کے بنیادی حقائق سے بیش از بیش تبدیل ہو رہی ہیں۔

اسپین میں ہم، اسلام کے ساتھ آٹھ صدیوں کی قربت اور اسلامی دور کے انمول ورثے کے باعث اسلام کے بنیادی اصولوں کے بارے میں بالخصوص بہت اچھی طرح جانتے ہیں اور شاید اسی بنا پر اسلام کے خلاف نفرت کی موجودہ مہم کے باوجود ہمیں تعصبات اور سچائی میں امتیاز کرنے کی خصوصی صلاحیت حاصل ہے۔ بعض لوگ اسلام کو انتہا پسندی کا علم بردار قرار دے کر لوگوں کے ذہنوں کو الجھانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ہم ٹھیک جانتے ہیں کہ قرآن کے قوانین کو ہر شخص پر زبردستی لاگو کرنا تو دور کی بات ہے، اسلام حقیقتاً مختلف ثقافتوں کے تنوع کی نہ صرف اجازت دیتا بلکہ تکثیریت پر مبنی ثقافت کا تحفظ کرتا ہے۔ اسپین کے اندر اسلام کے دور حکمرانی میں نظریاتی لحاظ سے ایک دوسرے سے متغائر کلچر حیرت انگیز طور پر پوری آن بان سے ساتھ ساتھ زندہ رہے۔ جہاں تک سماجی اور ثقافتی خودمختاری کے معاملات کا تعلق ہے تو اسلامی حدود میں رہنے والے غیر مسلموں کے حقوق کے لیے مہیا کیے گئے تحفظات اس حد تک جاتے ہیں کہ ان کی رو سے غیر مسلموں کو ایسے رسوم و رواج کو بجالانے کی بھی آزادی دی گئی ہے جو اسلامی تعلیمات سے صریحاً متصادم ہیں۔ اسلام تمام انسانوں کے شرف و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وقار کا محافظ ہے اور جو لوگ مسلمان نہیں ہیں ان کے حقوق کے احترام کا بھی علم بردار ہے۔

بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو ایک شخص، ایک جمعیت یا ایک قوم کسی دوسرے سے سیکھ سکتی ہے، لیکن انسانیت اپنے مشترکہ تجربات سے اس وقت تک ایک دوسرے کو مستفید کرنے کے قابل نہیں ہو سکتی جب تک باہمی احترام کا اہتمام انہیں ایک دوسرے کے ساتھ مثبت طور پر معاملات کرنے کے قابل نہ بنا دے۔ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے لیے اس احترام اور اس محبت کو انسانی ترقی اور فلاح کی بنیاد بنایا جانا چاہیے۔

سوال: جزیہ کا طریقہ جو اسلام کے ابتدائی دور میں رائج تھا، کیا جدید معاشرے میں بھی قابل نفاذ ہے؟ کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ یہ طریقہ کچھ امتیازی معلوم ہوتا ہے اور اگر اسے دوبارہ عمل میں لایا جائے تو اسلامی قانون کے ہم عصر ماہرین کو اس کے تمام پہلوؤں پر بھرپور نظر ثانی کرنا ہوگی؟

ڈاکٹر غازی: جزیہ کے لغوی معنی در حقیقت ''تلافی'' یا ''بدل'' کے ہوتے ہیں۔ یہ غیر مسلموں پر زکوۃ کے بجائے اور مسلمان ریاست کی جانب سے اُن کی حفاظت اور دفاعی خدمات کی انجام دہی کے بدلہ میں عائد کیا جانے والا ایک محصول تھا۔ یہ مسلمان حکومت کی طرف سے غیر مسلموں پر ان کو تحفظ اور پناہ مہیا کیے جانے کے بدلے لگایا جانے والا ایک ٹیکس تھا۔ ابتدائی مسلم تاریخ میں اور اس کے بعد بھی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ جب متعلقہ مسلمان حکومتوں کے لیے غیر مسلموں کے کسی گروپ کو تحفظ فراہم کرنا ممکن نہیں رہا تو ان سے وصول کیے گئے محصولات کی ساری رقوم انہیں واپس لوٹا دی گئیں۔ انسانی تاریخ میں شاید ہی ایسی کوئی دوسری مثال مل سکے کہ ایک حکومت نے محصولات کی جمع شدہ رقم ٹیکس دہندگان کو اس بناء پر واپس کر دی ہو کہ یہ رقم ان سے جس مقصد کے لیے حاصل کی گئی تھی، اسے پورا کرنا حکومت کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ جزیہ کی کوئی متعین رقم نہیں ہے، یہ مختلف اوقات میں مختلف ہو سکتی ہے۔ اسے کم کیا جا سکتا ہے، اس کا کوئی حصہ معاف کیا جا سکتا ہے، اور اسے مکمل طور پر ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف زکوۃ کی شرح میں نہ کمی جا سکتی ہے، نہ اس کا کوئی حصہ معاف کیا جا سکتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے اور نہ ہی اس کی شرح میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

مزید یہ کہ مسلمان فقہاء متفق ہیں کہ غیر مسلموں پر جتنا جزیہ ایک بار عائد کردیا جائے، اس میں کبھی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ جزیہ کی جو رقم ایک بار متعین کردی جائے، ہمیشہ وہی رہے گی اور اسلامی تاریخ میں ایسا ہی ہوا ہے۔ مثال کے طور پر شام میں دوسرے خلیفہ راشد کے دور میں غیر مسلموں کے ایک گروپ پر جزیہ عائد کیا گیا۔ دوسری صدی ہجری کے آغاز یعنی عمر ثانی، عمر بن عبدالعزیز کے دور تک یہی رقم ان سے وصول کی جاتی رہی۔ ان کے دور خلافت میں انہیں بتایا گیا کہ بعض غیر مسلم یہ محصول بھی ادا نہیں کرتے ہیں۔ جب محصول وصول کرنے والے ان کے پاس پہنچتے ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے اسلام قبول کرلیا ہے، اور عام اصول یہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم اعلان کردے کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے، تو نہ صرف جزیہ بلکہ سابقہ واجبات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ تو یہ لوگ اس طرح ٹیکس دینے سے بچ جاتے ہیں جبکہ عملاً غیر مسلم ہی رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ کئی سال چلتا رہا اور بالآخر اسے عمر ثانی، اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے علم میں لایا گیا۔ مقامی گورنر نے خلیفہ سے ان غیر مسلموں کی جانب سے اسلام قبول نہ کرنے کے بہانے کو نہ ماننے اور ان سے اس وقت تک جزیہ وصول کرنے کی اجازت مانگی تھی جب تک یقینی شواہد اور دوسرے ذرائع سے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ انہوں نے واقعی اسلام قبول کرلیا ہے۔ تاہم خلیفہ نے نہ صرف یہ کہ ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ انہوں نے اس تجویز پر ناراضی کا اظہار بھی کیا۔ انہوں نے اس گورنر کو برطرف کردیا جس نے یہ سفارش کی تھی اور اسے جواب میں ایک جملہ لکھا جو محاورہ بن گیا۔ انہوں نے عربی میں لکھا ''اِنّ اللہ بَعَثَ مُحَمّداً ھَادِیاً وَّلَمْ یَبْعَثْہُ جَابِیاً'' مطلب یہ کہ اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانیت کا ہادی و رہبر بنا کر بھیجا ہے، ٹیکس کلکٹر بنا کر نہیں۔

سوال: غیر مسلموں میں وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے اس تاثر کی موجودگی میں کہ مسلمان ایک متشدد اور جارح قوم ہیں، اسلام میں انسانی مساوات کے تصور کی آپ کس طرح تعریف یا تشریح کریں گے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈاکٹر غازی: سب سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ اسلام نے یہ بات پیشگی طے کر دی ہے کہ انسان کی عزت اور وقار کو ہر ایک کی جانب سے تسلیم کیا جانا چاہیے۔ اگر ہر انسان کو وقار و احترام کا حق دار باور نہ کیا جائے تو انسانوں کے درمیان حقیقی معنوں میں مساوات اور برابری کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے پہلی چیز شرفِ انسانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی ۱۷ ویں سورۃ کی ۷۰ ویں آیت میں اعلان فرما دیا ہے کہ:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ آدَمَ

(اور ہم نے اولادِ آدم کو عزت بخشی)

آدم کی تمام اولاد کو ذات پات، رنگ و نسل اور دوسرے تمام امتیازات سے بالاتر ہو کر عزت عطا کی گئی ہے۔ یہ ہے وہ اصول جسے مساوات کی حتمی بنیاد کی حیثیت سے تسلیم کیا جانا چاہیے۔ اس انسانی مساوات کا تقاضا ہے کہ عدل و انصاف ہر ایک کو حاصل ہونا چاہیے۔ اگر معاشرے میں انصاف نہ ہو تو برابری کا دعویٰ بے معنی ہو جائے گا۔ انصاف کی ضمانت کسی بھی فرق یا امتیاز کے بغیر ہر فرد کو مہیا کی جانی چاہیے۔

مسلمانوں کی تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ غیر مسلم شہریوں کو مسلمان حکمرانوں کے اقدامات سے بچایا گیا اور یہ بچانے والے کوئی سیکولر یا غیر اسلامی روایات کی نمائندگی کرنے والے لوگ نہیں بلکہ مسلمان فقہا یعنی اسلامی قانون کے ماہرین تھے۔ شام میں بنو تغلب کے نام سے معروف ایک عیسائی قبیلہ آباد تھا جو مسلم ریاست کے لیے بعض مسائل پیدا کیا کرتا تھا۔ عباسی حکمراں منصور نے اس کے خلاف، اس قبیلے اور خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان ہونے والے معاہدے کی خلاف ورزی کے ذریعے نہیں بلکہ اس معاہدے کی از سر نو تعبیر و تشریح کے ذریعے، تادیبی کارروائی کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس وقت کے ایک عظیم فقیہ امام اوزاعی جو امام ابو حنیفہ کے ہم عصر تھے، اس عیسائی قبیلے کو خلیفہ کی کارروائی سے بچانے کے لیے میدان میں آ گئے۔ انہوں نے خلیفہ منصور کو ایک بہت پر زور خط لکھا اور اسے قبیلے کے خلاف اقدام سے باز رکھا۔ اس طرح انصاف ہر ہر فرد کو فراہم کیا جانا، اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ریاست کی جانب سے ہر شہری کو کسی فرق وامتیاز کے بغیر حقوق کی فراہمی نیز ان حقوق کی حفاظت کو یقینی بنایا جانا چاہیے۔

شہریوں کے درمیان مساوات کے قیام کے لیے تین چیزوں کا یقینی بنایا جانا ضروری ہے:

۱) احترام انسانی
۲) ہر شخص کو انصاف کی فراہمی
۳) یکساں مواقع

اگر سب کو یکساں مواقع فراہم نہ ہوں تو برابری کے تمام دعوے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ تین بنیادی ضروریات دنیا کے بہت سے ملکوں اور بہت سے معاشروں میں ہر فرد کو حاصل نہیں ہیں۔ مسلمان بالخصوص محسوس کرتے ہیں کہ وہ عدل، منصفانہ برتاؤ، برابر کے مواقع حتیٰ کہ اس عزت و احترام سے بھی محروم ہیں جو بحیثیت انسان ان کا حق ہے۔ امتیازی سلوک کا مطلب حق سے محروم کیا جانا ہے، یہ چیز مایوسی اور احساس محرومی کو جنم دیتی ہے اور احساس محرومی معاشرے کے لیے نقصان دہ رویوں کا سبب بنتا ہے۔

دہشت گردی کا خاتمہ، دہشت گردی کے اسباب کو دور کیے بغیر ممکن نہیں۔ جب تک بے انصافی ختم نہ ہو اور مسلمانوں کو حقوق کی ضمانت نہ ملے، اس وقت تک احساس محرومی کا خاتمہ اور تشدد سے بچاؤ ممکن نہیں۔ تشدد کے خلاف جنگ کے نام پر جو اقدامات بین الاقوامی برادری کی جانب سے کیے جا رہے ہیں، ان کا کھوکھلا اور غیر مؤثر ہونا پوری طرح ظاہر ہو چکا ہے۔ اسلحہ خانے ان لوگوں سے لڑنے کے لیے کبھی کافی نہیں ہو سکتے جو مروجہ نظام سے مایوسی اور ناراضگی کی وجہ سے جنگ پر آمادہ ہو گئے ہوں۔ تشدد سے پاک پرامن دنیا کی تخلیق کا واحد طریقہ ایسے معاشرے کی جانب پیش قدمی ہے جو احساس محرومی سے مبرّیٰ ہو۔ احساس محرومی سے آزاد دنیا صرف اس طرح وجود میں لائی جا سکتی ہے کہ عدل و انصاف اور سب کے لیے مواقع میں برابری کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر انسانی سرگرمیوں کے تمام میدانوں میں پالیسی سازی کے ناگزیر اصولوں کے طور پر اختیار کیا جائے۔ مسلم دنیا کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلاف ان بے انصافیوں کا ارتکاب عشروں سے کیا جا رہا ہے، اور دنیا آج جو کچھ دیکھ رہی ہے، وہ ان امتیازی اور استحصالی اقدامات کا مجموعی نتیجہ ہے جس کا سامنا مسلمان اٹھارویں صدی میں مغربی طاقتوں کے عروج کے دور سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ماضی کی استعماری طاقتیں شاید اپنے ان ظالمانہ رویوں کو بھول گئی ہوں، لیکن بہت سے مسلمان انہیں ابھی تک نہیں بھولے۔ یہ باتیں ان کی نفسیات، ان کے اجتماعی شعور اور آگہی کا حصہ بن گئی ہیں۔ ان کا طرز عمل معمول کے مطابق نہیں ہے اور کسی بھی صورت میں اس کی سفارش نہیں کی جا سکتی۔ اس کے بجائے احساس محرومی کے لیے تشدد کی راہ اختیار کرنے کی حوصلہ شکنی اور اسے چھوڑ دینے کی تلقین کی جانی چاہیے تھی مگر دنیا کی سربراہی کرنے والی قوموں کا ذہنی وعملی رویہ نوآبادیاتی دور کے بعد بھی تبدیل نہیں ہوا، اور مطلوبہ تبدیلی لانے میں حائل بنیادی مسائل اب بھی حل کیے جانے کے منتظر ہیں۔

سوال: آپ نے کہا کہ اسلام میں طبقے، ذات، نسل یا ثقافت کی بنیاد پر کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا، اور یہ کہ اسلام مذہبی آزادی، تحمل و برداشت اور تکثیریت کے تصورات کی تائید کرتا ہے۔ میرے خیال میں اسلام کا نظام تعزیرات غیر مسلموں پر قابل اطلاق نہیں ہے۔ اسلام کے ان اصولوں کے پیش نظر کسی اسلامی ریاست مثلاً پاکستان میں رہنے والی اقلیتوں پر قانون انسداد توہین رسالت کے اطلاق کو کیسے درست قرار دیا جا سکتا ہے؟

ڈاکٹر غازی: آپ نے سوال کے بجائے سوالات کا مجموعہ میرے سپرد کیا ہے۔ اس کے جواب کے لیے ایک گھنٹے کی مزید گفتگو کی ضرورت ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے یہ نہیں کہا کہ اسلام کا نظام تعزیرات غیر مسلموں پر کاملاً قابل اطلاق نہیں ہے۔ سیاق وسباق کی رو سے بات اس طرح نہیں تھی۔ جو بات میں نے کہی وہ یہ تھی کہ غیر مسلم معاشروں میں اقلیت کی حیثیت سے رہنے والے مسلمانوں سے اسلام کے نظام تعزیرات کے نفاذ کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے۔ یہ ان کی ذمہ داری نہیں۔

تاہم اس سے ملتا جلتا ایک زیادہ معقول سوال غیر مسلموں پر حدود قوانین کے قابل نفاذ ہونے سے متعلق ہو سکتا ہے۔ حدود قوانین دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کا مقصد عمومی طور پر انسانی جان و مال کا تحفظ ہے اور دوسرے وہ جن کا مقصد خاص طور پر مسلم معاشرے کے اخلاقی حدود کی حفاظت ہے۔ پہلی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نوعیت کے حدود قوانین مسلمان اور غیر مسلم سب پر قابل نفاذ ہیں کیونکہ ہر شہری کے جان و مال کی حفاظت اس کی مذہبی وابستگی سے بالاتر رہتے ہوئے کی جانی چاہیے۔ قصاص دونوں پر قابل اطلاق ہے۔ چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا دونوں کے لیے ہے۔ ڈکیتی کی سزا دونوں کے لیے ایک ہے۔ یہ پہلی قسم کی سزائیں ہیں کیونکہ ہر شخص کی جان اور مال و جائیداد کی حفاظت ضروری ہے۔ اس بناء پر ان میں کوئی تفریق روا نہیں رکھی جا سکتی۔

حدود کی دوسری قسم وہ ہے جس کا مقصد مسلمان معاشرے کی اخلاقی قدروں کا تحفظ ہے۔ اس صورت حال میں قانون غیر مسلموں پر لاگو نہیں ہوتا۔ رجم کی سزا اور شراب پینے کی سزا کا اطلاق غیر مسلموں پر نہیں ہوتا۔ اسی طرح قذف کی سزا بھی غیر مسلموں پر لاگو نہیں ہوتی۔ آج بھی حدود قوانین میں صاف طور پر لکھا ہوا ہے کہ یہ سزائیں صرف مسلمانوں پر قابل نفاذ ہیں۔ اگر غیر مسلم مطالبہ کریں کہ ان کے لیے بھی ایسا ہی بندوبست کیا جائے تو انہیں یہ مطالبہ کرنے کی آزادی ہے جبکہ یہ فیصلہ حکومت کرے گی کہ ان کا مطالبہ منظور کیا جائے یا مسترد۔

جہاں تک انسداد توہین رسالت کے قانون کا تعلق ہے تو سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قانون انسداد توہین رسالت جو پاکستان میں نافذ ہوا، نہ تو پاکستان کی کسی حکومت کی طرف سے اسے ایجاد کیا گیا تھا نہ اس کے ہاتھوں اس کا آغاز ہوا تھا۔ یہ قانون انڈین پینل کوڈ میں شامل تھا جس کا نفاذ برطانوی حکومت نے ڈیڑھ سو سال پہلے ۱۸۶۰ء میں ہندوستان میں کیا تھا۔ یہ قانون بھارت اور بنگلہ دیش میں آج بھی نافذ ہے۔ یہ انڈین پینل کوڈ کے سیکشن ۲۹۵ میں درج تھا۔ ابتداء میں سیکشن ۲۹۵ کے تحت کسی بھی درجے کے شہری کے مذہب یا مذہبی عقیدے کی توہین کو ممنوع قرار دیا گیا اور اس کے ارتکاب پر قید کی سزا مقرر کی گئی جسے دو سال کی مدت تک بڑھایا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد اسی برطانوی دور اقتدار میں بعض ایسے واقعات ہوئے جن میں کچھ لوگوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کیا جس کے نتیجے میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان عوامی سطح پر تنازع شروع ہو گیا۔ برطانوی حکمرانوں نے محسوس کیا کہ اس کی وجہ شاید سزا کا کم ہونا ہے۔ اس کے بعد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۹۲۷ء میں غازی علم الدین کے واقعے کے فوراً بعد سزا کی مدت [دس سال تک] بڑھا دی گئی۔ غازی علم الدین کے معاملے کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس مقدمے میں علامہ اقبال نے مداخلت کی اور قائداعظم نے ہائی کورٹ میں غازی علم الدین کا دفاع کیا۔

بعد میں محسوس کیا گیا کہ دس سال کی سزا بھی کافی نہیں ہے اور اس میں اضافہ ہونا چاہیے چنانچہ ۱۹۶۰ء میں مغربی پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں کے متعدد فیصلوں میں توہین رسالت کے کئی پہلوؤں پر بحث کی گئی اور اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کی جانب سے آبزرویشنز دی گئیں جن میں حکومت کو توہین رسالت کے قوانین پر نظر ثانی کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

اس کے بعد جب لاہور کے ایک وکیل کی جانب سے اس قانون کو چیلنج کیا گیا جس میں وفاقی شرعی عدالت سے اپنے فیصلے کے ذریعے اس قانون کو اسلام کے اصل تقاضوں کے مطابق ڈھالنے اور وسعت دینے کی درخواست کی گئی تھی، تو وفاقی شرعی عدالت نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ یہ سزا کافی نہیں ہے، اور اسے موت کی سزا ہونا چاہیے۔[۲۰] اس میں کسی صورت مسلمان یا غیر مسلم کا کوئی سوال نہیں ہے۔ جو شخص بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے گا، یا آپ کی ذات پر کیچڑ اچھالے گا، اسے موت کی سزا دی جائے گی۔ حکومت نے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بنچ میں اپیل کی۔ اپیل کے زیر غور ہونے کے عرصے میں سینیٹ نے متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی جس میں حکومت پاکستان سے اپیل واپس لینے اور اس جرم کی صرف ایک سزا یعنی سزائے موت مقرر کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس قرارداد اور ملکی رائے عامہ کے پیش نظر حکومت نے اپیل واپس لے لی۔ اس طرح وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ مؤثر ہو گیا اور اس جرم کے ارتکاب پر موت کی سزا اب واحد قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ قانون مسلمان اور غیر مسلم ہر ایک پر یکساں طور پر لاگو ہے۔

میں حیران ہوتا ہوں جب سنتا ہوں کہ یہ قانون غیر مسلموں کے حقوق پامال کرتا ہے۔ آخر قانون یا منطق کے کون سے اصول کے تحت ایک غیر مسلم کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گستاخی اور دنیا کے کروڑوں مسلمانوں کو قلبی اذیت پہنچانے کا اختیار اور آزادی ہونی چاہیے؟

اس معاملے کا ایک اور پہلو انسداد توہین رسالت کے قانون کے طریق کار کی تفصیلات کے حوالے سے اٹھایا گیا ہے۔ الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ قانون بے گناہ لوگوں کے خلاف غلط طور پر استعمال کیا جارہا ہے اور بالخصوص اقلیتوں کے خلاف ہے۔ یہ معاملات طریق کار کو تبدیل کر کے یا قانون کے غلط استعمال کے خلاف ضمانتیں فراہم کر کے طے کیے جاسکتے ہیں۔ بے بنیاد شکایات کے ذمہ داروں کو سزا دی جانی چاہیے۔

محض یہ حقیقت کہ کسی قانون کا غلط استعمال کیا جاتا رہا ہے، اس قانون کے مکمل طور پر خاتمے کے مطالبے کے لیے کافی نہیں ہے۔ مجموعہ تعزیراتِ پاکستان میں پانچ سو سے زائد سیکشن ہیں۔ ان میں سے تقریباً ہر ایک سیکڑوں نہیں تو کم از کم درجنوں بار غلط طور پر استعمال کیا جاچکا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مجموعہ تعزیرات کو منسوخ کردیا جانا چاہیے؟ اگر کسی قانون کا غلط استعمال ہو تو اسے طریق کار کے لحاظ سے بہتر بنایا جانا چاہیے۔

یہ مسئلہ اسلامی نظریاتی کونسل میں پوری تفصیل کے ساتھ زیرِغور لایا گیا تھا۔ کونسل نے میری تجویز پر حکومت سے کہا تھا کہ اس قانون کے غلط استعمال کو روکنے کے تین طریقے ہوسکتے ہیں، اور حکومت ان میں سے کوئی ایک، دو یا تینوں اختیار کرسکتی ہے: ۱) اگر کوئی شخص اس قانون کے تحت کسی بے گناہ شخص کے خلاف بدنیتی کے ساتھ شکایت کرنے کا مجرم پایا جائے تو اسے وہی سزا دی جائے جو اس قانون کی رو سے جرم کے لیے مقرر ہے۔ ۲) اگر رپورٹ کیے گئے واقعہ کے بارے میں شبہ ہو کہ توہین کا ارتکاب ہوا ہے یا نہیں، تو یہ معاملہ دیکھنے اور طے کرنے کے لیے کہ جرم کا ارتکاب ہوا ہے یا نہیں، اسلامی نظریاتی کونسل یا وفاقی شرعی عدالت کو بھیجا جاسکتا ہے یا پھر بہتر تفہیم اور غیر جانبداری کے لیے ہائی کورٹ کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے۔ ۳) پولیس کے کردار کو کم کیا جاسکتا ہے، اور شکایت براہ راست سیشن کورٹ میں درج کرائی جاسکتی ہے۔ اس قانون کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے ان کے علاوہ دوسرے طریقے بھی ہوسکتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں یہ بات بھی یاد رکھی جانی چاہیے کہ یہ قانون صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ اس کی رو سے حضرت عیسیٰ، حضرت موسیٰ، اور دوسری محترم ہستیوں سمیت ہر پیغمبر اور ہر مذہبی شخصیت کی اہانت قابل سزا جرم ہے۔

سوال: چند سال پہلے ایسوسی ایشن آف ایشین پارلیمنٹیرینز فار پیس' اقوام متحدہ کو بین المذاہب کونسل کے قیام کی تجویز دے چکی ہے اور یہ تجویز ۲۰۰۹ء میں ہونے والی عالمی امن سربراہ کانفرنس کے موقع پر اقوام متحدہ میں پوری تفصیل سے زیر بحث آچکی ہے۔ اس تجویز کا اصل زور یا اصل مقصد بین الاقوامی امن اور ہم آہنگی کی خاطر تہذیبوں کے درمیان عالمگیر مذہبی تعاون اور رابطے کا اہتمام ہے۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ انسانی برادری کے مشترکہ مقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے یہ ایک مفید تصور ہو سکتا ہے؟

ڈاکٹر غازی: ذاتی طور پر میں اس خیال کا حامی ہوں، نیز میں ایک اور تناظر میں بھی اس کی تائید کرتا ہوں۔ قازحستان کے صدر نے ۲۰۰۳ء میں ایک کنونشن بلایا تھا، جسے انہوں نے ''اے کنونشن آف ریلیجنز'' کا نام دیا تھا۔ مختلف مذہبی مکاتب فکر کے نمائندے دنیا کے مختلف حصوں سے مدعو کیے گئے تھے، اور میزبان صدر مذاہب کا ایک مستقل مرکز یا مستقل سکریٹریٹ قائم کرنا چاہتے تھے۔

انہوں نے کنونشن کے باقاعدہ آغاز سے پہلے ابتدائی تبادلہ خیال کے لیے وفود کے سربراہوں کو بلایا۔ اس موقع پر میں نے عرض کیا کہ اس تجویز کی کم از کم ان دو وجوہ کی بناء پر حمایت کی جانی چاہیے کہ اولاً دنیا میں مختلف گروہوں کو متعدد ایسے سیاسی اور فوجی مسائل کا سامنا ہے جو بنیادی طور پر مذہبی، ثقافتی اور سماجی معاملات کی پیداوار ہیں۔ اقوام متحدہ کی تشکیل مسائل کے ان پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے نقطہ نظر سے نہیں ہوئی ہے، اس کا میکانزم مسائل کا صرف سیاسی یا فوجی حل تجویز کرتا ہے۔ یہ میکانزم بسا اوقات بنیادی مسئلے پر توجہ دینے میں ناکام رہتا ہے چنانچہ نہ صرف گروہوں بلکہ ریاستوں کے باہمی تنازعات بھی اقوام متحدہ کی کوششوں کے نتیجے میں عموماً حل ہونے کے بجائے محض وقتی طور پر دب جاتے ہیں۔ ایسی مثالیں مل سکتی ہیں جن میں مثلاً دو گروہوں کی نفسیات میں مذہبی تعصب اتنا گہرا ہو کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کسی قسم کے روابط پر تیار ہی نہ ہوں۔ یہ تعصب کسی سیاسی مسئلے کو ابھارنے یا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فوجی ناکامی کی صورت حال پیدا کرنے کا سبب بن سکتا ہے اور اس کے نتیجے میں پورا متعلقہ خطہ مشکلات میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ اقوام متحدہ ایسے حالات میں اغلباً مسئلے کے سیاسی اور فوجی پہلوؤں کو دیکھے گی مگر جب تک وہ پیچیدہ مذہبی قضیہ سلجھایا نہیں جائے گا، اس وقت تک سطح پر موجود سیاسی اور فوجی مسائل کا پائیدار حل دریافت نہیں کیا جاسکے گا۔ اس بناء پر ایسے مرکز کا قیام ایک اچھا خیال ہے جہاں مذہبی معاملات اور غلط فہمیوں پر بات چیت کی جائے اور مختلف مذاہب کے لوگ مشترکہ انسانی کاز کی خاطر اور مجموعی طور پر مشترکہ انسانی مقاصد کی جانب پیش قدمی کے لیے ایک دوسرے کے قریب آئیں۔

ثانیاً، یہ تجویز اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ تمام مذاہب کے ماننے والے بالخصوص مسلمان محسوس کرتے ہیں کہ جس مذہب کی پیروی وہ کرتے ہیں وہ ان میں سے بیشتر مسائل کا بہترین حل پیش کرسکتا ہے جن سے آج انسانیت زندگی کے مختلف شعبوں میں دوچار ہے۔ اپنے اس اعتقاد کی بناء پر وہ اپنا نقطہ نظر دوسروں پر واضح کرنے کا اشتیاق رکھتے ہیں۔ چنانچہ اگر اس مقصد کو پورا کرنے والا ایک مشترکہ پلیٹ فارم موجود ہو جہاں ہر مذہب کا نقطہ نظر یکساں اور درست طور پر سنا اور سمجھا جائے تو اس طرح باہمی مفاہمت کے لیے بہتر ماحول پیدا ہوگا اور بین الاقوامی امن اور ہم آہنگی کے لیے فضا سازگار ہوگی۔

میں آپ کو خود اپنی مثال دیتا ہوں۔ میں عیسائیت کے بارے میں برسوں اور عشروں تک مختلف کتابیں پڑھتا رہا، لیکن اس درجہ دلچسپی کے باوجود مجھے اعتراف ہے کہ میں عیسائیت کے بارے میں ایک بہت بڑی غلط فہمی کا شکار تھا۔ میں ہمیشہ یہ سمجھتا رہا کہ بائبل، جس شکل میں آج یہ عیسائیوں کے پاس ہے (چار انجیلیں)، ہمارے قرآن جیسی ہی کوئی چیز ہے، اور باہمی تبادلہ خیالات، تقاریر اور خطابات میں ہمیشہ قرآن اور چار انجیلوں کے درمیان موازنہ کرنے کا رجحان رکھتا تھا۔ پھر مجھے کچھ وقت برمنگھم میں گزارنے کا موقع ملا جہاں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کا ایک مرکز ہے۔ اس کالج میں تقریباً دو ہفتے کے قیام کے دوران یہ غلط فہمی دور ہوگئی۔ پہلی بار مجھے اس حقیقت کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ادراک ہوا کہ مسیحی انجیلوں کی تعبیر اس طرح نہیں کرتے جیسے مسلمان قرآن کی تعبیر کرتے ہیں۔اس کے بجائے یہ ہماری سیرۃ النبیؐ کی طرح ہیں اور انہیں محض پیغمبر کی سوانح حیات کے ماخذ باور کیا جاتا ہے۔اس چیز نے انجیلوں کے مطالعے کے حوالے سے ایک مختلف تناظر کو جنم دیا اور اس کے بعد سے میں نے اسی سیاق وسباق میں ان کا مطالعہ کرنے اور حوالہ دینے کا طریقہ اپنایا۔لہٰذا اگر کوئی ایسا پلیٹ فارم ہو جو دوسرے مذاہب کی بہتر اور براہ راست تفہیم کا ذریعہ بن سکے اور علم اور معلومات کے تبادلے کے مواقع مہیا کرے تو اس سے قوموں اور گروہوں کے درمیان کشیدگی میں کمی ہوگی۔

سوال: دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمان اقلیتوں کی قابل لحاظ تعداد آباد ہے اور کئی علاقوں میں وہ ایک دوسرے سے متصل آبادیوں کی شکل میں رہتے ہیں۔میزبان آبادیوں میں بالعموم انہیں تارکین وطن کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے لیکن نسلی مسلمان آبادی کو چین میں خودمختار علاقے کا خصوصی مقام دیا گیا ہے۔چین کے اندر سنکیانگ کے حوالے سے بعد میں رونما ہونے والے سماجی اور ثقافتی پہلوؤں اور سیکیوریٹی کے معاملات کے پیش نظر، اقلیتوں کے حقوق اور اس کے ساتھ ساتھ قومی امن اور اتحاد کے تحفظ کے نقطہ نظر سے دونوں نمونوں میں آپ کسے زیادہ قابل عمل سمجھتے ہیں؟

ڈاکٹر غازی: چین میں مسلم اقلیت کا سوال بہت پیچیدہ ہے۔جہاں تک میں سمجھتا ہوں، چین میں مسلمانوں کی دو قسمیں ہیں۔ایک مرکزی علاقوں میں رہنے والے مسلمان جو ہر جگہ بہت چھوٹی اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔دوسری قسم کے مسلمان وہ ہیں جو مختلف علاقوں کے اندر اکثریت میں ہیں جس کی ایک مثال سنکیانگ ہے۔

چینی قیادت کی سمجھ بوجھ پر مجھے پورا بھروسہ ہے کہ وہ آگے آئے گی اور مسلمانوں کی ان دونوں قسموں اور ان کے تقاضوں کے درمیان امتیاز کرے گی جو دو مختلف حالات میں رہ رہے ہیں۔میرے خیال میں جن پالیسیوں کو چینی حکومت مرکزی علاقے کے مختلف حصوں میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے مناسب سمجھتی ہے، وہ ان مسلمانوں کے لیے پوری طرح قابل عمل نہیں ہوسکتیں جو کئی علاقوں میں اکثریت کی حیثیت سے آباد ہیں۔ایک ایسے مسلمان کی ضروریات اور جذبات جو اپنے گردوپیش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمان اکثریت کو پاتا ہو، یقینی طور پر ان مسلمانوں سے مختلف ہوں گے جو ان لوگوں کے درمیان رہتے ہیں جو ان کے ہم عقیدہ نہیں ہیں۔ جو مسلمان بہت چھوٹی سی اقلیت کی حیثیت سے ایک غیر مسلم اکثریت کے درمیان رہتے ہیں، وہ چند انتظامی اقدامات سے مطمئن ہو سکتے ہیں۔لیکن جو خود اپنے علاقوں میں رہتے ہیں جہاں آبادی کا بیشتر حصہ ان ہی پر مشتمل ہے، وہ زیادہ آزادی کے خواہش مند ہو سکتے ہیں، اور اس کا فیصلہ مسلمانوں کے ماضی کے طرزِ عمل کی روشنی میں کیا جانا چاہیے۔اگر حکومتِ چین مسلمان آبادی کی ضروریات کا قرآنی ہدایات کی روشنی میں جائزہ لے اور چینی قیادت اپنے قومی فریم ورک کے اندر ان ضروریات کی تکمیل کے لیے مثبت اقدامات عمل میں لائے تو مجھے یقین ہے کہ مسلمان آبادی اپنے وطن کی حیثیت سے چین کی ترقی اور خوش حالی کے لیے اور زیادہ خلوص اور محنت سے کام کرے گی۔ تاہم اگر سارے مسلمانوں کے ساتھ ایک ہی طرح کا رویہ رکھا گیا، تو مجھے اندیشہ ہے کہ یہ مسلمان آبادی کی جائز ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی نہیں ہوگا۔اگر چینی قیادت اس عمل کے دوران محسوس کرتی ہے کہ پڑوسی ملکوں میں رہنے والے مسلمان، چین کے مسلمان اکثریتی علاقوں کے لیے پالیسی کی تشکیل میں اپنی تجاویز اور مشاورت کے ذریعے معاونت کر سکتے ہیں، تو میں سمجھتا ہوں کہ پڑوسی مسلمان بھی کسی بھی قسم کے تعاون یا مدد کی فراہمی میں خوشی محسوس کریں گے۔

سوال: منصفانہ معاشرے کے ایک ذریعے کی حیثیت سے آپ نے سب کے لیے مساوی مواقع کی فراہمی پر زور دیا ہے۔آپ اس پر کیا تبصرہ کریں گے کہ مسلمان آبادی کے ایک حصے یعنی قادیانیوں کو ریاست کی جانب سے غیر مسلم قرار دے کر مساوی مواقع کے حقوق اسے دینے سے انکار کر دیا گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ آپ جانتے ہیں کہ ایران اور سعودی عرب جیسے کئی مسلمان ملکوں میں غیر مسلم خواتین تک کے لیے سر ڈھانکنا ضروری ہے، اس کے باوجود مسلمان ان غیر مسلم ریاستوں کی مذمت کرتے ہیں جہاں حجاب پر پابندی ہے۔مسلمان ملکوں میں غیر ملکی زائرین تک پر کئی شخصی قوانین کے بہ اصرار نفاذ اور غیر مسلم ملکوں میں ان کے قوانین کے مسلمانوں پر نفاذ کی مزاحمت پر آپ کس طرح تبصرہ کریں گے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈاکٹر غازی: اس سوال کے پہلے حصے کے الفاظ اور جملوں کی تشکیل سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ پاکستان میں قادیانیوں کے معاملے میں ایسا نہیں ہے کہ مسلمانوں کے ایک گروہ کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا ہو۔ فی الحقیقت غیر مسلموں کا ایک گروہ جو اصرار کرتا تھا کہ اس کے ساتھ مسلمانوں کی حیثیت سے برتاؤ کیا جائے، اسے غیر مسلم قرار دیا گیا ہے۔ درست بات یہ ہے کہ یہ قادیانی تھے جنہوں نے مسلمانوں کو غیر مسلم قرار دیا اور اس پر مسلمانوں کا جواب، قادیانیوں کے اپنے بیان کا فطری نتیجہ ہے۔ دوسری تفصیلات میں آراء کا اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن ایک چیز بہت واضح ہے کہ قادیانی ایک مختلف مذہب کے ماننے والے ہیں، اور یہی اس آئینی فیصلے کا نچوڑ ہے جو پاکستان کی قومی اسمبلی کی جانب سے متفقہ طور پر کیا گیا تھا۔ کسی رکن اسمبلی نے اس کے خلاف ووٹ نہیں دیا تھا حتیٰ کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے لیے کی جانے والی قانون سازی کے وقت کوئی رکن، اسمبلی کے اجلاس سے غیر حاضر بھی نہیں تھا۔ تمام ارکان حاضر تھے اور ان میں سے ہر ایک نے اس آئینی ترمیم کے حق میں ووٹ دیا۔ ایسا فیصلہ ان لوگوں اور ان طبقوں کی جانب سے زیادہ احترام کا متقاضی ہے جو دوسرے معاملات میں جمہوریت اور پارلیمنٹ کی بالادستی پر یقین رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

جہاں تک شخصی قانون کے حوالے سے کیے گئے سوال کا تعلق ہے، تو یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ پاکستان میں رہنے یا یہاں آنے والے کسی غیر مسلم پر مسلم شخصی قانون کبھی زبردستی نافذ نہیں کیا گیا۔ پاکستان کے غیر مسلموں کے اپنے شخصی قوانین ہیں، اور اس بارے میں متعلقہ قوانین مکمل آزادی اور تحفظ مہیا کرتے ہیں۔ عدالتیں ان کے مقدمات کے فیصلے ان کے اپنے شخصی قانون کے مطابق کرتی چلی آرہی ہیں، اور اس ضمن میں کبھی کوئی بڑا مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔

حجاب کا مسئلہ بہرکیف شخصی قانون سے متعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق معاشرے کے مجموعی تانے بانے سے ہے۔ اگر معاشرہ اخلاقی اصولوں پر مبنی ہے، اور ان کے معاشرے میں اخلاقی اقدار بالاتر سمجھی جاتی ہیں، تو ان کی سلامتی اور حفاظت کے اہتمام کو یقینی طور پر جائز تسلیم کیا جانا چاہیے۔ یہ اسی طرح درست ہے جیسے معاشی مفاد پر مبنی ایک معاشرہ کی جانب سے اپنے معاشی مفادات کے تحفظ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بچاؤ کی کوششوں کو جائز باور کیا جاتا ہے۔ ایک مسلمان معاشرے کے لیے اخلاقی اصول اور روحانی سوچ مختلف نسلی اور ثقافتی پس منظر رکھنے والے افراد کو باہم جوڑتی ہے۔ اس لیے صنفوں کے درمیان تعلقات کا سوال ہو، ذات کے اظہار کا معاملہ ہو یا لباس اور دوسری چیزوں کا، ایک مسلمان کے نقطہ نظر سے ان سب کو اسلام کی اخلاقی فکر کے سیاق میں دیکھا جانا چاہیے۔ اگر سعودی عرب اور ایران جیسا کوئی ملک باہر سے آنے والی خواتین سے اپنے جسم کو مناسب طور پر ڈھانکنے کا مطالبہ کرتا ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ یہ ان کے انسانی حقوق یا مساوات کے منافی ہے۔ لیکن ایک ایسے معاشرے میں جہاں انفرادی آزادیاں اس حد تک دستیاب ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہو کہ کوئی مرد یا عورت خود کو مکمل طور پر برسرِ عام عیاں کر سکتا ہو، وہاں ایک خاتون کو اپنی پسند کا لباس پہننے کے حق کو استعمال کرنے سے محض اس وجہ سے روکا جانا کیسے درست ہو سکتا ہے کہ وہ مسلمان ہے؟ اگر ایک مسلمان خاتون کو عوام کی رقوم سے چلنے والے عوامی ادارے میں، جس میں مسلمان ٹیکس دہندگان بھی شامل ہیں، اپنا سر ڈھانپنے کا حق دینے سے انکار کیا جاتا ہے، تو اس رویے سے نظام میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مغرب، خصوصاً فرانس دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے تین بنیادی اصولوں آزادی، برابری اور بھائی چارگی پر اپنے معاشرے کی تعمیر کی ہے۔ اگر یورپ کی ایک مخصوص برادری کے معاملے میں آزادی، برابری اور بھائی چارگی کے اصولوں پر سمجھوتہ کیا جائے گا تو ان معیارات کے بارے لازماً سوالات اٹھیں گے۔ اگر یہ واضح اصول اب بھی فرانسیسی اور بحیثیت مجموعی پوری مہذب دنیا کے نظام کی بنیاد کے پتھر ہیں، تو ان پر مسلمانوں کے معاملے میں بھی عمل کیا جانا چاہیے۔

(ترجمہ: ثروت جمال اصمعی)

..................حواشی..................

۱- مثال کے طور پر دیکھیے، شا، ۱۹۹۷ء، ص: ۲۱۸ تا ۲۲۳

۲- دیکھیے، علاوہ دیگر، حمید اللہ، ۱۹۸۷ء، ص: ۱۱۱ تا ۱۱۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳- بخاری، الجامع الصحیح، ''کتاب الجنائز''، حدیث نمبر ۱۲۶۳
۴- حمید اللہ، ۱۹۸۶
۵- مکمل متن کے لیے، دیکھیے ابوعبید، ۱۸۸
۶- یہ بیان کئی اتھارٹیز کی جانب سے نقل کیا گیا ہے، دیکھیے، علاوہ دیگر، زیلعی، نصب الرایہ لأ حادیث الہدایہ، جلد چہارم، ص: ۵۵
۷- حمید اللہ، ۱۹۸۷، ص: ۱۱۲
۸- دیکھیے باب ''......... اہل الذمہ'' فقہ پر بنیادی خلاصوں میں
۹- سرخسی، ۱۹۵۷ء، ص: ۳۰۶، اور زیلعی، ایضاً، ص: ۵۵
۱۰- ابوداؤد، السنن، ''کتاب الملاحم''، باب ذکر الحبشہ، حدیث نمبر ۴۳۰۹، دار السلام، ریاض
۱۱- مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے، غازی، ۲۰۰۷ء، ص: ۴۸۳ تا ۵۲۱
۱۲- دیکھیے، احمد اور بخاری، ۲۰۰۸ء
۱۳- غازی، ایضاً
۱۴- القرآن، ۲۲: ۴۱
۱۵- غازی، ص: ۳۸ تا ۴۰، ص: ۴۶-۴۷، اور ص: ۵۱۱ تا ۵۱۵
۱۶- خان، ۱۹۹۶ء، ص: ۲۶۰۹
۱۷- جسٹس ایلون رابرٹس کارنیلیس (۱۹۰۳-۱۹۹۱)
۱۸- جسٹس رانا بھگوان داس
۱۹- جناب انتونیو سیگو راموس نے پاکستان میں اسپین کے سفیر کی حیثیت سے (۲۰۰۲ء تا ۲۰۰۵ء) خدمات انجام دیں۔ وہ اس مجلس کی صدارت کر رہے تھے۔
۲۰- پی ایل ڈی، فیڈرل شریعت کورٹ، جلد XLIII، ص ۱۰۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتابیات

Abu Ubaid. n.d. Kitab al-Amwal, ed. Muhammad Hamid al-Fiqqi. Cairo.

Ghazi, Mahmood Ahmad. 2007. Khutbat-i-Bahawalpur: Islam Ka Qanun Bain al-Mamalik. Islamabad.

Hamidullah, Muhammad. 1987. The Muslim Conduct of the State. Lahore.

---. 1986. The First Written Constitution in the World. Lahore.

Ibn al-Humam, Kamal. N.d. Fath al-Qadir. Vol. 5. Quetta.

Yusufi, Khurshid Ahmad Khan. Speeches, Statements & Messages of the Quaid-e-Azam.Vol. IV. Lahore, Bazm-i-Iqbal.

Ahmad, Khurshid and Bukhari, Zahid 2008. Islam in the West, Policy Perspectives, Vol. 5, No. 1. Islamabad: Institute of Policy Studies.

Marghinani, al-. Al-Hidayah. Kitab as-Siyar, Chapter on Kaifiyyat al-Qital.

Sarakhsi, Abu Bakr al-. 1957. Sharh al-Siyar al-Kabir. Vol. 1. Cairo.

Shaw, Malcolm N. 1997. International Law, Cambridge.

Zailiee' al-Muhalli, Muhammad. 1938. Nasb al-Rayah li Ahadith al-Hidayah. Vol.IV. Surat, India: Majlis al-Ilmi

© rasailojaraid.com